نئی لائبریری

پرانے خدا

35/-

افسانے

کرشن چندر

نیا ادارہ

25.00

پرانے خُدا

کرشن چندر

پرانے خدا

نیا ادارہ • لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: نذیر احمد چوہدری
نیا ادارہ ، لاہور

ترتیب

مقدّمہ	پروفیسر عزیز احمد	۷
پُرانے خدا		۱۴
چڑیا کا غلام		۳۰
مثبت اور منفی		۳۷
جھیل سے پہلے جھیل کے بعد		۴۶
حادثے		۵۴

غلاظت	۶۸
مقدّس	۸۱
پہلی اُڑان	۸۹
ایک سوریئیلی تصویر	۱۰۸
آتا ہے یاد مجھ کو	۱۲۹
خوشبو کا سفر	۱۵۰

مقدمہ

گذشتہ چند سال کے عرصے میں اردو ادب میں ایک نئے دَور کا آغاز ہُوا ہے۔ نیا دَور ہمیشہ ایک طرح کے ذہنی انقلاب کے ساتھ آتا ہے۔ نئے دَور میں اقدار بدل جاتی ہیں؛ نئی اقدار کے بَل بوتے پر نئے ادیب پُرانی شاہراہ سے منہ موڑتے ہیں۔ اور اپنے لیے ایک نیا راستہ بناتے ہُوئے آگے بڑھتے ہیں۔

اِس نئے ادب میں کوئی نام اس قدر عزّت اور توصیف کا مستحق نہیں جتنا کرشن چندر صاحب کا نام ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ نئے ادیبوں میں سے اور کسی کی فکر میں اتنا ٹھہراؤ، اتنا سلجھاؤ نہیں جتنا ان کی فکر میں ہے۔ نئے ادب کے محرکات سے ان کی ہمدردی بے لوث ہے۔ ان میں اندھا جوش یا انتہا پسندی نہیں۔ اور اگر خیالات میں وہ نئے ادیبوں کے رہنما ہیں تو فن کی حد تک بھی نئے لکھنے والوں میں کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا کہ یہ ان کے فن کا ابتدائی دَور ہے۔ اگر وہ اس طرف لگے رہے اور ان کا انہماکِ فن

اور خلوصِ فکر۔ اِسی طرح پروان چڑھتا گیا تو ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اِن کا نام منشی پریم چند کے نام سے بھی زیادہ احترام کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

یہ مجموعہ ان کے چند تازہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلا افسانہ "پُرانے خُدا" ہے۔ اس کا موضوع نئے افسانوی ادب کے ساتھ ہی ساتھ اُردو میں آیا۔ "انگارے" میں بھی یہ موضوع بار بار دُہرایا گیا تھا۔ لیکن کرشن چندر کے اس افسانے میں کہیں گالیاں نہیں۔ پُرانے خداؤں سے نہیں بلکہ پُرانے "خدا پرستوں" سے افسانہ نگار کو حقیقی دلچسپی ہے۔ لطیف اور پُرخلوص طنز۔ یہاں وہ کام کر جاتا ہے جو راست اعتراض سے نہیں ہو سکتا۔ منظر نگاری کی حد تک یہ افسانہ ایک شاہکار ہے۔ متھرا کے ہر قسم کے پجاری، وہاں کے رہنے والے، اور وہاں آنے والے سب زندہ تصویروں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ تصویریں ہیں اور ان کی معاشی تاویلیں ہیں۔ مگر اس خوبی سے کہ وہ تصویروں کا رنگ معلوم ہوتی ہیں۔ آخر میں کرشن اور رادھا کا قصّہ ہے۔ ہندوستان کی عورت کا خلوص اور انتظار اور اس کا پھل۔ ایک ہلکی سی رومانیت ہے جو معاشی معانی پر شکر کی طرح چڑھی ہوئی ہے۔

"چڑیا کا غلام" انوکھے قسم کا افسانہ ہے۔ طنز اور تضحیک پر اِس کی بنیاد ہے۔ اس کا طرزِ صنعت مغربی موسیقی کی اس صنف سے ملتا جلتا ہے جس کو اصطلاح میں CAPRICE کہتے ہیں۔ موسیقی سے یہ صنف اس صدی میں ادب اور سینما میں منتقل ہوئی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کی شاعری میں اس کے نمونے ہیں۔ مغرب کے افسانیاتی ادب نے بھی اس کو

اختیار کیا ہے اور یہ افسانہ انہیں اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس افسانے کا کردار خاص "چڑیا کا غلام" اور دوسرے کردار اس طرح حرکت کرتے ہیں جیسے کسی رُوسی (BALLET) کے افراد۔ لیکن نفسیات کا دامن مصنف کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا اور سڑک کی عالمگیر لڑائی کے میدان میں جب ہیرو پھر نمایاں ہوتا ہے تو نفسیاتی بنیاد پر۔

"مثبت اور منفی" بھی جدید مغربی افسانیاتی تحریکات سے متاثر ہے اس کے اندازِ تحریر پر جیمز جائس اور اس تحریک کا اثر ہے جو (SURRELISM) تحریک ماورائے حقیقت نگاری کے نام سے چند سال تک یورپ میں مقبول رہی۔ اُردو میں یہ ایک انوکھی چیز ہے۔ کرشن چندر کا یہ افسانہ (یا مضمون) محض تقلید نہیں۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ مطلب شروع سے آخر تک واضح ہے۔ مطلب کی وضاحت کا باعث سلجھی ہوئی تصوریت (SYMBOLISM) ہے۔

"جھیل سے پہلے جھیل کے بعد" بہت دلچسپ ہے۔ انسان ہزارہا سال پہلے اور غالباً انسان کے ارتقاء کے ہزارہا سال بعد تک کشمیر کی طویل وادی ایک خوبصورت جھیل تھی اس کا ذکر قدیم ترین سنسکرت کتابوں میں بھی ہے، اور جدید جغرافیائی تحقیقات میں بھی۔ معلوم نہیں کسی انسان نے اس خوبصورت جھیل کو کبھی دیکھا بھی یا نہیں۔ اب اس کی یادگار کے طور پر ڈلر ڈل، مانس بن اور انچر کی جھیلیں باقی رہ گئی ہیں اور یہ جھیلیں بھی آہستہ آہستہ دل دل بنتی جا رہی ہیں۔ جب پانی نے رامپور کے قریب اپنے سنگین حصار کو توڑ دیا تو جہلم کو پنجاب پہنچنے کا راستہ مل گیا اور اپنے ساتھ وہ کشمیر کی جھیل کو بہا لے گیا۔ جہاں جھیل تھی، وہاں دنیا

کی خوبصورت ترین وادی وجود میں آئی۔ وہ وادی جس کے حسن اور جس کی غربت کی تصویر شاید کرشن چندر سے بہتر کسی اور نے اُردو نثر میں نہیں کھینچی۔ اِس وادی میں انسان نے قدم رکھا گھر بنائے۔ رہنے لگا۔ اپنے ساتھ وہ تمدن لایا اور انسان آئے۔ جاگیردارانہ نظام آیا۔ سرمایہ دارانہ دَورِ حکومت آیا۔ اور وہ وادی جو جھیل سے جنت بنی تھی، انسانوں کے لیے جہنم بن گئی۔

"حادثے" ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ اور انسان کی نفسیاتی خود غرضی کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ دُو طرح کی محبتوں کی کش مکش کی کہانی ہے۔ ایک جو زیادہ طوفانی ہے، وقتی طور پر کامل فتح پاتی ہے۔ دوسری دل کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی ہے اور چونکہ آزمائش کے وقت وہ ہار چکی ہے، اس لیے پچھتاوا بن کے عمر بھر کے لیے زندگی تلخ کر دیتی ہے۔

"غلاظت" ایک دلچسپ سفر کی داستان ہے، اور اس سفر میں گرد میں اٹے ہُوئے انسانی کردار اپنے آپ کی اور اپنے ماحول اور تربیت کی غلاظت ہر منزل پر نمایاں کرتے جاتے ہیں۔

"مقدس" بڑا دلچسپ افسانہ ہے۔ اس کی بنیاد ایک بڑی گہری نفسیاتی حقیقت پر ہے۔ اور اس کی تعمیر طنز اور شوخی سے ہُوئی ہے ایک عام شخصیت کا نفسی ہیجان جو معاشیات اور محبت کے اعلیٰ مثالی تصور کے تصادم سے پیدا پیدا ہوتا ہے۔ اس افسانے کا پس منظر ہندوستان کے ایک بڑے شہر کی جھوٹی چمک والی، مغرب زدہ، چکا چکا بوم چک کرتی ہُوئی زندگی ہے۔ اس پس منظر کی ترغیب آہستہ آہستہ ہیرو کے نفسی ہیجان کو اُبھارتی ہے جو پہلے ہی

معاشی مجبوریوں کا زخم خوردہ ہے، اور بالآخر جنسی خمار بن کے اسے دبوچ لیتی ہے۔ افسانے کا انجام نفسیاتی باریک بینی کا شاہکار ہے۔ اس میں نفسیاتِ تحلیلی اور معاشی توجیہہ مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

"پہلی اڑان"، کشمیر کے پس منظر میں ایک "اصلاحی" افسانے کی نہج پہ شروع ہوتا ہے اور ہیرو کی پہلی اُڑان کے ساتھ ایک معاشی اور "رومانی" انجام پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے وہ اس افسانے کے "عام" موضوع میں ہے۔ یعنی غربت اور اس لالچ کی وجہ سے جو غربت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غریب لڑکیاں اپنی آبرو بیچتی ہیں۔ لیکن یہ موضوع کشمیر کی غریب رعایا کی عورتوں پر اس تفصیل اور تکرار سے صادق نہیں آتا۔ کشمیری عورتوں میں اور خصوصاً غریب ترین طبقے میں عفت اور عصمت کا احساس انتہا درجہ کا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غربت اور بھوک کے آگے عزت اور آبرو کا سوال باقی نہیں رہتا لیکن اس قسم کے واقعات استثنا کی صورت رکھتے ہیں۔ نہ کہ کلیہ کی۔ کنہیالال کپور نے اپنے مضمون "رومان کی تلاش" میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں اس موضوع کی "عام" منطقی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس قسم کے افسانوں کی محرک ایک طرح کی پُرجوش رومانیت ہوتی ہے جو دست چپ کے ہندوستانی افسانہ نگاروں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔

یہی پُرجوش رومانیت کرشن چندر کے اسلوبِ تحریر میں روحِ رواں کا کام انجام دیتی ہے۔ اس کی ٹھیس سے الفاظ اور خیالات یک جہت اور یک عنصر ہو کے چشموں کی طرح اُبل پڑتے ہیں۔

مثلاً پہلے ہی افسانے میں :۔

" اجنبی نا اُمید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دُور — ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے وہ اس جھونپڑے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا۔ لیکن اُسے کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہُوئی، کیونکہ دروازہ کُھلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں، رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے چہرے پر لاتعداد جھریاں ----- کرشن جی نے گلوگیر آواز میں کہا "رادھا میں آگیا ہُوں" لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی۔ دیئے کی لَو کی طرف تکتی ہُوئی۔ رادھا میں آگیا ہُوں۔ کرشن جی نے چلّا کر کہا، لیکن رادھا نے کچھ دیکھا نہ سُنا۔ اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور کان بہرے ---

" زندگی سے پرے، موت سے پرے، انصاف سے پرے ..."

جہاں تک طرزِ تحریر کا تعلق ہے۔ اُردو کا کوئی اور افسانہ نگار کرشن چندر کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ درد ہو یا طنز، رومانیت ہو حقیقت نگاری، ان کا قلم ہر موقع پر ایسی دل کش چال چلتا ہے جو بانکی بھی ہوتی ہے اور انوکھی بھی لیکن جو اس قدر سادہ اور فطری ہوتی ہے۔ جیسے صبح کے وقت چڑیوں کی پرواز، تصنع کا بعید ترین شائبہ بھی کہیں پایا جاتا۔ جو نفسِ مضمون ہوتا ہے اس کی

اندرونی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کے ان کا قلم حرکت کرتا ہے۔

لیکن جو چیز کرشن چندر کو اور تمام ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اپنے نفسِ مضمون کے بیان اور خیالات کے اظہار میں ان کی بے تعصّبی ہے۔ ان میں جوش و خروش ہے لیکن تعصب نہیں۔ اُن میں ایک ایسی ذاتی ہمدردی ہے جو کسی طرح کی منافرت کے لیے گنجائش باقی نہیں چھوڑتی۔ یہی سچّی انسانی ہمدردی اشتراکیت کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ یہ جوہر کرشن چندر کو عقیدتاً بھی ملا ہے اور طبعاً بھی اس ہمدردی اور خلوص کی وجہ سے جو کچھ کہتے ہیں ٹھہراؤ اور ضبط کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کی چٹکیاں تکلیف دہ نہیں ہوتیں مگر اپنا کام کر جاتی ہیں۔ وہ گالیاں نہیں دیتے۔ یا تو اپنے شیریں اندازِ تحریر میں سمجھاتے ہیں یا شوخی اور طنز کے ذریعے اشاروں اشاروں میں مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں۔ وہ قدامت پسندی کی رجعتوں کے سب سے زیادہ مخالف ہیں، لیکن ان کی مخالفت بغاوت کا علم نہیں بلند کرتی، وہ ایک نئی سرداری کا علم بلند کرتی ہے۔ جس سے قدیم سرداری خود بخود باطل قرار پا جاتی ہے

میں شروع ہی میں لکھ آیا ہوں کہ یہ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا ابتدائی دَور ہے۔ اسے اِن کا "رُومانی دَور" کہا جا سکتا ہے۔ میری پیشین گوئی ہے کہ وہ ایک دن اِس دَور سے نکل کے دوسرے دَور میں قدم رکھیں گے جو عمر اور تجربے کی وجہ سے اُن کے حُسنِ نیت اور حُسنِ حقیقت نگاری کو دوبالا کر دے گا۔ وہ دور صرف ان کے لئے ہی نہیں، اُردو ادب کے لیے بھی مبارک ہوگا

عزیز احمد

بنجارہ ہل
حیدر آباد دکن

۲۵ اکتوبر ۴۲ء ۱۹

پُرانے خُدا

متھرا کے ایک طرف جمنا ہے اور تین طرف مندر، اس حدود اربعہ میں ناقی حلوائی، پانڈے، پجاری اور ہوٹل والے بستے ہیں۔ جمنا اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ نئے نئے عالی شان مندر بھی تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن متھرا کا حدود اربعہ وہی رہتا ہے، اس کی آبادی کی تشکیل اور تناسب میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونے پاتی۔ سوائے ان دنوں کے جب اشٹمی کا میلہ معلوم ہوتا ہے۔ کرشن جی کے بھگت اپنے بھگوان کا جنم منانے کے لیے ہندوستان کے چاروں کونوں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان دنوں کرشن جی کے بھگت متھرا پر یلغار بول دیتے ہیں، اور مدراس سے، کراچی سے، رنگون سے، پشاور سے، ہر سمت سے ریل گاڑیاں آتی ہیں اور متھرا کے اسٹیشن پر ہزاروں جاتری اُگل دیتی ہیں، جاتری سمندر کی لہروں کی طرح بڑھے چلے آتے ہیں اور مندروں گھاٹوں، ہوٹلوں اور دھرم شالاؤں میں سما جاتے ہیں۔ متھرا میں کرشن بھگتوں

کے استقبال کے لیے پندرہ بیس روز پہلے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مندروں میں صفائی شروع ہوتی ہے۔ فرش دھلائے جاتے ہیں۔ کلسوں پر دھات پالش۔ چڑھایا جاتا ہے، زرکار ہنگوڑے اور جھولے سجائے جاتے ہیں دیواروں پر قلعی اور رنگ ہوتا ہے۔ دروازوں پر گل بوٹے بنائے جاتے ہیں دکانیں رادھا کرشن جی کی مورتیوں سے سجائی جاتی ہیں۔ حلوائی پوری کچوری کے لیے بناسپتی گھی کے ٹین اکٹھے کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے کرائے ڈگنے بلکہ سہ گنے ہو جاتے ہیں۔ دھرم شالائیں چونکہ خیراتی ہوتی ہیں اس لیے اُن کے مینجر ایک کمرے کے لیے صرف ایک روپیہ کرایہ وصول کرتے ہیں۔ کسان لوگ جو ان خیراتی دھرم شالاؤں میں ٹھہرنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ عموماً جمنا کے کسی گھاٹ پر ہی سو رہتے ہیں۔ گھاٹ چونکہ پختہ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں؛ اس کے لیے گھاٹ منتظم سونے والے جاتریوں سے ایک آنہ فی کس وصول کر لیتے ہیں اور اصل گھاٹ پر سونے کے لیے ایک آنے کا تاوان بہت کم ہے۔ کنارہ جمنا۔ سر پر کدم کی پرچھائیاں؛ جمنا کی لہروں کی میٹھی میٹھی لوریاں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ تاروں بھرا آسمان اور مندروں کے چمکتے ہوئے کلس جب جی چاہا سو رہے۔ جب جی چاہا اُٹھ کر جمنا میں ڈبکیاں لگانے لگے۔ ایک آنے میں دو مزے، اس پر بھی بہت سے کسان لوگ گھاٹ کے غریب منتظموں کو ایک آنہ کرایہ بھی ادا کرنا نہیں چاہتے اور گھاٹ پر سونے اور جمنا پر نہانے کے مزے مفت میں لوٹنا چاہتے ہیں۔ انسان کی فطری کمینگی ----- !

جنم اشٹمی سے دو روز پہلے میں متھرا میں آ پہنچا، متھرا کے بازار، گلیاں اور مندر جاتریوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور جاتریوں کے ریوڑوں کو مختلف

مندروں میں داخل کر رہے تھے، ان جاتریوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے احساس ہُوا کہ متھرا میں ہندوستان بھر کی بوڑھی عورتیں جمع ہو گئی ہیں؛ بوڑھی عورتیں مالا پھیرتی ہوئیں اور لاٹھی ٹیک کر چلتے ہُوئے مرد... کھانستی ہوئی، گٹھیا کی ماری ہُوئی۔ ریشہ براندام مخلوق جو یہاں اپنے گناہ بخشوانے کی اُمید میں آئی تھی۔ جتنی بدصورتی یہاں میں نے ایک گھنٹے کے عرصے میں دیکھ لی، اتنی شاید میں اپنی ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکتا۔ متھرا کا یہ احسان میں قیامت تک نہیں بھُول سکتا۔

متھرا پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے رہنے کے لیے جگہ تلاش کی۔ ہوٹل والوں نے بالکونیاں تک کرایہ پر دے رکھی تھیں۔ اور ان کی کھڑکیوں، دروازوں اور بالکونیوں پر جا بجا جاتریوں کی گیلی دھوتیاں ملولیں لہراتی دکھائی دیتی تھیں دھرم شالائیں جاتریوں سے بھڑ کے چھتّوں کی طرح بھری ہُوئی تھیں۔ کوئی مندر بنگالیوں کے لیے وقف تھا تو کوئی مدراسیوں کے لیے، کسی دھرم شالہ میں صرف نمبودری برہمنوں کے لیے جگہ تھی تو کسی میں صرف کایستھ ٹھہر سکتے تھے۔ اس سرائے میں اگروالوں کو ترجیح دی جاتی تھی، تو دوسری سرائے میں صرف امرتسر کے ارڈرے ٹھہر سکتے تھے۔ ایک دھرم شالہ میں ایک کمرہ خالی تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر پانڈے جی سے کہا۔ میں ہندو ہُوں، یہ دیکھیے ہاتھ پر میرا نام کھدا ہُوا ہے۔ اگر آپ انگریزی نہیں پڑھ سکتے تو چلئے بازار میں کسی سے پڑھوا لیجئے۔ غریب جاتری ہوں اپنی دھرم شالہ میں جگہ دے دیجئے آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

پانڈے جی کی آنکھیں غلافی تھیں اور بھنگ سے سُرخ، جیسوا کا مقدّس تاگا ننگے پیٹ پر لہرا رہا تھا۔ کمر میں رام نام کی دھوتی تھی۔ چند لمحوں تک چپ چاپ

گھورتے مجھے گھورتے رہے، پھر گنگیائی ہوئی آواز میں جس میں پان کے چونے اور کتھے کے لیلے سے اُٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، بولے آپ کون ہو۔

میں نے جھلا کر کہا، میں انسان ہوں، ہندو ہوں، کالا شاہ کاکو سے آیا ہوں۔

ناں، ناں! پانڈے جی نے اپنا بایاں ہاتھ گوتم بدھ کی طرح اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم پوچھت ہیں۔ آپ کون گوت ہو؟

گوت؟ میں نے رُک کر کہا۔ مجھے اپنی گوت تو یاد نہیں۔ بہرحال کوئی نہ کوئی گوت ضرور ہوگی۔ آپ مجھے فی الحال اپنی دھرم شالہ۔ اس خیراتی دھرم شالہ میں رہنے کے لیے جگہ دے دیں، میں گھر پہ تار دے کر اپنی گوت منگوائے لیتا ہوں۔

ناں، ناں! پانڈے جی نے پان کی پیک زور سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ہم ایسو مانس کیسو راکھیں؟ نہ گوت نہ جات!

میں متھرا کے بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ فضا میں کچوریوں کی کڑوی بوجھنا کے مہین کیچڑ کی سڑاند اور بناسپتی گھی کی گندی باس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی متھرا کی خاک جاتریوں کے قدموں میں تھی، ان کے کپڑے میں تھی، اُن کے سر کے بالوں میں، ناک کے نتھنوں میں حلق میں، میرا دم گھٹا جاتا تھا اور جاتری شری کرشن مہاراج کی جے کے نعرے لگا رہے تھے۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے رہنے کے لیے ابھی تک کہیں جگہ نہ ملی تھی۔ ایک پنواڑی کی دکان پر میں نے ایک خوش پوش خوش رو نوجوان کو دیکھا کہ سر تاپا برّاق کھدر میں ملبوس، پان کلّے میں دبائے کھڑا ہے، آنکھوں سے اور چہرے سے ذہانت کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔

مسٹر؟ میں نے اُسے نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا۔ کیا آپ مجھے جیل خانے کے سوا یہاں کوئی اور ایسی جگہ بتا سکتے ہیں جہاں ایک ایسا انسان جو ہندو ہو، پنجابی ہو، کالا شاہ کاکو سے آیا ہوا اور جسے اپنی گوت کا علم نہ ہو، میلے کے دنوں اپنا سر چھپا سکے؟

نوجوان نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا، چند لمحوں کے لیے مجھے گھورتا رہا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ آپ پنجابی ہیں نا! اسی لیے آپ یہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں ... دراصل بات یہ ہے کہ ... معاف کیجیے گا ... پنجابی بڑے بدمعاش ہوتے ہیں، یہاں سے لڑکیاں اغوا کر لے جاتے ہیں۔

اور ان لڑکیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو اس طرح اغوا ہو جاتی ہیں؟ میں نے پوچھا۔

ایک دبلا پتلا آدمی جس کا قد بانس کی طرح لمبا تھا اور منہ چھچھوندر کا سا کھدر پوش نوجوان کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ بابو صاحب، آپ متھرا کی بات کیوں کرتے ہیں۔ متھرا تو پوتر نگری ہے۔ میں تو بمبئی تک گھوم آیا ہوں، وہاں بھی پنجابیوں کو شریف محلوں میں کوئی گھسنے نہیں دیتا۔

دو چار لوگ ہمارے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ کیا آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟

جی ہاں! خوش رو نوجوان نے پان چباتے ہوئے جواب دیا۔

تو آپ کو معلوم ہو گا کہ پنجاب سب سے آخر میں انگریزوں کی عملداری میں آیا۔ اور چھوٹی بچیوں کو جان سے مار ڈالنے کی رسم جو ہندوستان کے صوبوں

میں بھی رائج تھی۔ پنجاب میں سب سے آخر میں خلافِ قانون قرار دی گئی ___ انگریزوں کے آنے سے پہلے شریف لوگ اکثر اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے

اُس سے کیا ہوا؟"

ہُوا یہ کہ پنجاب میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ۵ : ۱ ہو گیا۔ پانچ مرد اور ایک عورت، اب بتائیے باقی چار مرد کہاں جائیں، مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر عورت ایک دم چار پانچ خاوند کر سکے، جیسا کہ تبّت میں ہوتا ہے، کیا آپ اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔

نوجوان ہنسنے لگا۔

میں نے کہا پنجاب میں لڑکیاں کم ہیں۔ پنجابیوں نے دوسرے صوبوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا، بنگال میں لڑکیاں زیادہ ہیں۔ وہاں لوگ ایک بیوی رکھتے ہیں اور ایک داشتہ جو عموماً ودھوا ہوتی ہے، سندھی اور گجراتی مرد سمندر پار تجارت کے لیے جاتے ہیں اور اکثر گھروں سے کئی سال غائب رہتے ہیں۔ اسی لیے سندھ میں اوم منڈلیاں بنتی ہیں اور گجرات میں بکری کے دودھ اور برہمچریہ کا پرچار ہوتا ہے۔ مرض ایک ہے، نوعیت وہی ہے؛ اب آپ ہی بتائیے کہ شریف کون ہے اور بدمعاش کون؟ جو حقیقت ہے آپ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتے۔ اُلٹا پنجابیوں کو کوستے ہیں۔

نوجوان بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسا، پان گلے سے موری میں جا گرا، وہ میرے بازو میں بازو ڈال کر کہنے لگا۔ آئیے صاحب میں آپ کو اپنے گھر لیے چلتا ہوں۔"

تھوڑے ہی عرصے میں ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے

وہ ایک نوجوان وکیل تھا۔ ایک کامیاب وکیل، اس کا ذہین چہرہ، فراخ ماتھا، اور مضبوط ٹھوڑی اس کے عزم راسخ کی دلیل تھے۔ وہ مدراسی برہمن تھا۔ متھرا میں سب سے پہلے اُس کا دادا آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے دادا کے کسی رشتہ دار نے جو مدراس میں ایک مندر کا پجاری تھا، کسی آدمی کو قتل کر دیا، ٹھاکر جی کو ایک پجاری کے گناہ کے بارے بچانے کے لیے میرے دوست کے دادا نے ایک رات کو مندر سے ٹھاکر جی کی مورتی کو اُٹھا لیا اور ایک گھوڑے پہ سوار ہو کر مدراس چل دیا۔ سفر کرتے کرتے وہ متھرا آن پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس کی آتما کو سکون نصیب ہُوا۔ اور اُس نے ٹھاکر جی کو ایک مندر میں ستھاپت کر دیا۔ آج اسی دادا کا پوتا میرے سامنے مندر کی دہلیز پر کھڑا تھا اور میں اس کے گٹھے ہُوئے جسم اور چہرے کے تیکھے نقوش میں اس بوڑھے برہمن کے عزم اور اعتقاد کی جھلک دیکھ رہا تھا جس کی تصویر اس کی بیٹھک میں آویزاں تھی۔

نہا دھو کر اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم میلے کی سیر کو نکلے، جو گلی بازار سے دشرام گھاٹ کی طرف جاتی ہے اس میں سینکڑوں نائی بیٹھے استروں سے جاتریوں کے سر مونڈ رہے تھے۔ گول گول چمکتے ہُوئے، منڈھے ہُوئے سر اُن سپید چھتریوں کی طرح دکھائی دیتے تھے جو برسات کے دنوں میں خود بخود زمین پہ اُگ آتی ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان سپید سپید چھتریوں پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرا جائے!
اتنے میں ایک نائی نے میری آنکھوں کے سامنے ایک چمکدار اُسترا گھمایا اور مسکرا کر بولا، بابو جی سر منڈا لو، بڑا پُن ہوگا، میں نے اپنے دوست سے پُوچھا یہ جاتری لوگ سر کیوں منڈاتے ہیں؟ کہنے لگا۔ دان پُن کرنے کی خاطر۔ یہ لوگ اپنے مرے ہُوئے

عزیزوں کی رُوحوں کے لیے دان پُن کرنا چاہتے ہیں اور اُس کے لیے سر منڈانا بہت ضروری ہے اور یہاں ایسا کون شخص ہے جس کا اب تک کوئی عزیز یا رشتے دار نہ مرا ہو، میں نے جواب دیا میری چندیا پر پہلے ہی تھوڑے سے بال ہیں۔ میں انہیں حجام کی دست بُرد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہُوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہُوں کہ ایک بال جو چندیا پر ہے اُن بالوں سے کہیں بہتر ہے جو حجام کی مٹھی میں ہوں، ہم لوگ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہُوئے وشرام گھاٹ پہنچ گئے۔ گھاٹ پر بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں اور لوگ ان پر بیٹھ کر جمنا جی کی سَیر کے لیے جا رہے تھے ہم نے بھی ایک کشتی لی اور تین گھنٹے تک جمنا میں گھومتے رہے۔ جن کے کنارے پختہ گھاٹ بنے ہُوئے تھے۔ کہیں کہیں مندروں اور دھرم شالاؤں کی چوبرجیاں اور کدم کے درخت نظر آجاتے۔ ایک جگہ دریا کے کنارے ایک پُرانے شکستہ محل کے بلند کنگرے نظر آئے۔ استفسار پر میرے دوست نے بتایا کہ اسے کنس محل کہتے ہیں، میں نے کہا، تین چار سو سال سے زیادہ پُرانا معلوم نہیں ہوتا، کہنے لگا ہاں اسے کسی مرہٹہ سردار نے بنوایا تھا۔ اب زود الاعتقاد لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اُسی کنس کا محل ہے جس کے ظلموں کا خاتمہ کرنے کے لیے بھگوان نے جنم لیا تھا میں نے پُوچھا، کس زمانے میں ظلم نہیں ہوتے ؟ وہ ہنس کر بولا، اگر یہی پوچھنا تھا تو متھرا کیوں آئے۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیکھو ریل کا پُل ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ متھرا میں سب سے زیادہ خوبصورت شے یہی ریل کا پُل ہے۔ مضبوط، جیسد، بلند، ریل گاڑی نہایت پُرشکوہ انداز میں جمنا کے سینے کے اُوپر دندناتی ہُوئی چلی جا رہی تھی کہتے ہیں کہ کرشن جی کے جنم دن کو

جمنا فرطِ محبت سے اُمڈی چلی آتی تھی اور جب تک اس نے کرشن جی کے قدم نہ چھو لیے اس کی لہروں کا طوفان ختم نہ ہُوا۔ جمنا میں اب بھی طوفان آتے ہیں لیکن اس کی لہروں کی ہیجانی اس ریل گاڑی کے قدموں کو بھی نہیں چھُو سکتی جو اس کی چھاتی پر دندناتی ہُوئی چلی جا رہی ہے۔ جمنا کی سربلندی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔

جب ہم واپس آئے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور وشرام گھاٹ پر آرتی اتاری جا رہی تھی۔ عورتیں رادھے شیام، رادھے شیام گاتی ہُوئی جمنا میں نہا رہی تھیں شنکھ اور گھڑیال زور زور سے بج رہے تھے، جاتری چڑھاوا چڑھا رہے تھے، اور جمنا میں پھل اور پھول پھینک رہے تھے۔ پانڈے دکشنا سنبھالتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ آرتی اتارتے جاتے تھے۔ ایک پانڈے نے ایک غریب کسان کو گردن سے پکڑ کر گھاٹ سے باہر نکال دیا۔ کیونکہ کسان کے پاس دکشنا کے پیسے نہ تھے۔ شاید کسان سمجھتا تھا کہ بھگوان کی آرتی پیسوں کے بغیر بھی ہو سکتی ہے

وشرام گھاٹ کی نچلی سیڑھیوں تک جمنا بہتی تھی، لیکن یہاں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھا اور اس کیچڑ میں سینکڑوں چھوٹے موٹے کچھوے کلبلا رہے تھے اور مٹھائیاں اور پھل کھا رہے تھے۔ ان کے ملائم مٹیالے جسم ان جاتریوں کی ننگی کھوپڑیوں کی طرح نظر آتے تھے جن کے بال نائیوں نے مونڈ کر صاف کر دیئے تھے۔ رادھے کرشن رادھے کرشن، جاتری چلّا رہے تھے۔ نو بیاہتا جوڑے کشتیوں میں بیٹھے ہُوئے مٹی کے دیئے روشن کر کے انہیں جمنا کے سینے پر بہا رہے تھے۔ جن کے سینے پر اس قسم کے سینکڑوں دیئے روشن ہو اُٹھے تھے اور نو بیاہتا جوڑے مسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے، ہمارے بالکل قریب ہی

ایک زرد رُو نوجوان لڑکی نے مٹی کے دو دیئے روشن کیئے اور انہیں جمنا کے حوالے کر دیا۔ دیر تک وہ وہاں کھڑی اپنے ہاتھ اپنے سے لگائے اُن دیئوں کی طرف دیکھتی رہی اور ہم اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کی طرف دیکھتے رہے۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کا خاوند نہ تھا، نہ وہ بیاہتا معلوم ہوتی تھی، پھر ان جھلملاتے ہُوئے دیئوں کی لَو کو کیوں اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا،

یہ لرزتی ہُوئی شمع محبت ------ لڑکی نے یکایک میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے چل گئی۔ میرے دوست کے لب بھنچے ہُوئے تھے، رخساروں پہ زردی کھنڈی ہوئی تھی، کیا جمنا میں اتنی طاقت نہ تھی کہ محبت کے دو کانپتے ہُوئے شعلوں کو ہم آغوش ہو جانے دے۔ یہ دیواریں، یہ پانی کی دیواریں، پیسے کی دیواریں، سماج، ذات پات اور گوت کی دیواریں --- ! میرا دل غیر معمولی طور پہ اُداس ہو گیا۔ اور میں نے سوچا کہ میں کل متھرا سے ضرور کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ برندابن میں یا شاید گوکل میں، جہاں کی سادہ اور پاک وصاف فضا میں میرے دل کو اطمینان نصیب ہو گا۔

برندابن میں بن کم اور پکی گلیاں اور کھلی سڑکیں زیادہ تھیں، برندابن کے عالی شان مندروں کی وسعت اور عظمت پہ محلوں کا دھوکہ ہوتا تھا۔ راجہ مان سنگھ کا مندر، میرا کا مندر یا ہر عمارت میں کرشن جی کی مورتی موجود تھی، ہر جگہ پانڈے موجود تھے، لیکن ایک بات میں برندابن متھرا سے بڑھا ہوا تھا۔ برندابن میں گائیڈ بھی موجود تھے، انگریزی بولنے والے پڑھے لکھے گائیڈ، پہلے لوگ مندروں میں بے کھٹکے چلے جایا کرتے تھے، اب بھگوان نے گائیڈ رکھ لیے تھے، خدا ہی پُرانے تھے لیکن

جدید مذہب کے سارے لوازمات سے بہرہ ور۔ آخر یہ نئی تہذیب بھی تو اُنہیں کی بنائی ہُوئی تھی۔

برندابن کے ایک مندر میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں سات آٹھ سو سادھو ہاتھ میں کھڑتالیں لیے ایک ساتھ گا رہے تھے: رادھے شیام، رادھے شیام ۔۔۔۔ لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ ۔۔۔۔ باقاعدگی تنظیم، اندھا پن تہذیب اور طاقت کے ہزاروں راز اس رقت انگیز نظارے میں مستور تھے، ہر روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں جاتری اس مندر میں آتے تھے اور بے شمار چڑھاوا چڑھتا تھا، سُنا ہے کہ ان اندھے سادھوؤں کو صبح شام دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور ایک پیسہ دکشنا کا، باقی جو منافع ہوتا، وہ ایک لحیم شحیم پانڈے کی تجوری میں چلا جاتا، ایک اور مندر میں بھی میں نے ایسا ہی نظارہ دیکھا، فرق یہ تھا کہ یہاں اندھے سادھوؤں کے بجائے بے کس اور نادار عورتیں کرشن بھگوان کی استتی کر رہی تھیں۔ دن بھر اُستتی کرنے کے بعد اُنہیں بھی وہی راشن ملتا تھا جو اندھے سادھوؤں کے حصے میں آتا تھا۔ یعنی دو وقت کا کھانا اور ایک پیسہ دکشنا کا۔ ان اندھے سادھوؤں اور عورتوں کے سر منڈے ہُوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے وشرام گھاٹ کے جاتری اور جمنا کے کیچڑ میں کلبلاتے ہُوئے کچھوے یاد آ گئے۔ مذہب نے مندروں میں فیکٹریاں کھول رکھی تھیں اور بھگوان کو لوہے سے بھی زیادہ مضبوط سلاخوں کے اندر بند کر دیا تھا، ہر مندر میں ہر ایک جاتری کو ضرور کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ بعض دفعہ تو ایک ہی مندر میں مختلف جگہوں پر دکشنا ریٹ مختلف تھا۔ سیڑھیوں

کو چھونے کے لیے ایک آنہ، مندر کی چوکھٹ تک آنے کے لیے چار آنے۔ مندر کا کواڑ اکثر بند رہتا تھا اور ایک روپیہ دے کر جاتری مندر کے کواڑ کھول کر بھگوان کے درشن کر سکتا کئی ایک مندر ایسے تھے جو سال میں صرف ایک بار کھلتے تھے اور کوئی بڑا سیٹھ ہی اُن کی "بوہنی" کر سکتا تھا اور بہت سا روپیہ ادا کر کے مندر کے کواڑ کھول سکتا تھا۔ طوائفیت ہمارے سماج کا کتنا ضروری جزو ہے۔ اس بات کا احساس مجھے ایسے مندروں ہی کو دیکھ کر ہُوا ہے"

گوکل میں جمنا کے کنارے تین عورتیں ریت پر بیٹھی رو رہی تھیں، مارواڑ سے کرشن بھگوان کے درشن کرنے کو آئی تھیں، زیوروں میں لدی پھندی ایک سادھو مہاتما نے انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسا لیا اور گیان دھیان کی باتیں کرتے کرتے انہیں مختلف مندروں میں لیے پھرے، اور جب یہ مارواڑی عورتیں گوکل میں ماکھن چور کنھیا کا گھر دیکھنے آئیں تو یہ مہاتما بھی اُن کے ہمراہ ہو لیے، عورتیں جمنا میں اشنان کر رہی تھیں، اور سادھو کنارے پہ اُن کے زیوروں اور کپڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ جب عورتیں نہا دھو کر گھاٹ سے باہر نکلیں تو مہاتما جی غائب تھے، عورتیں سر پیٹنے لگیں، کرشن جی اگر ماکھن چراتے تھے تو سادھو مہاتما نے اگر چند زیور چرا لیے تو کون سا بُرا کام کیا۔ لیکن مہاتما کی یہ ٹیکنیک اُن بے وقوف عورتوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور وہ جمنا کی گیلی ریت پہ بیٹھی مہاتما جی کو گالیاں دے رہی تھیں۔ بہت سے لوگ اُن کے آس پاس کھڑے تھے اور وہ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

"جی بڑا ظلم ہُوا ہے اِن غریب عورتوں کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بھلا یہ گھر سے زیور لے کر ہی کیوں آئیں؟"

"اپنی امارت دکھانا چاہتی تھیں۔ اب رونا کس بات کا ۔ ۔ ۔ ؟"

"اجی صاحب شکر کیجئے ان کی جان بچ گئی۔ اب کل ہی متھرا میں۔ ایک پانڈے نے اپنے ججمان اور اس کی بیوی کو اپنے گھر لے جا کر قتل کر دیا۔ ججمان کا نیا نیا بیاہ ہُوا تھا۔ بیوی کے پاس ساٹھ ستر ہزار کا زیور تھا ۔ ۔ کسی مدراسی جاگیردار کا لڑکا تھا جی، اکلوتا لڑکا تھا ۔ ۔ ۔ اس کے باپ کو پولیس نے تار دیا ہے، خیال تو کیجئے کیسا اندھیر مچ رہا ہے اس پوتر نگری میں۔"

"متھرا تین لوک سے نیاری!"

بہت رات گئے میں اور میرا دوست جمنا کے اس پار کھیتوں میں گھومتے رہے۔ جنم اشٹمی کی رات تھی۔ پھونس کے جھونپڑیوں میں جن میں غریب مزدور اور کسان رہتے تھے، مٹی کے دیئے روشن تھے اور جمنا کے دوسرے کنارے گھاٹوں پر بجلی کے قمقمے اور برہمنوں کے قہقہوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ پھونس کے جھونپڑوں کے باہر مریل سی فاقہ زدہ گائیں بندھی تھیں اور نیم برہنہ لڑکے خاک میں کھیل رہے تھے۔ کنوئیں کی جگت پر ایک بوڑھی عورت آہستہ آہستہ ڈول کھینچ رہی تھی۔ دو بڑی بڑی گاگریں اس کے پاس پڑی تھیں۔ کنوئیں سے آگے آم کے درختوں کی قطار تھی جو بہت دُور تک پھیلتی ہُوئی چلی گئی تھی۔ آم کے درخت اور آنولے کے پیڑ اور کھرنی کے مدور جھنڈ سارے، یہاں گہرا سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ ہُوا میں ایک ہلکی اداس سی خوشبو تھی اور ستاروں کی روشنی ایسی جس میں سپیدی کے بجائے سیاہی زیادہ گھلی ہوئی تھی جیسے یہ روشنی کھل کر ہنسنا چاہتی ہے، لیکن

شام کی اداسی کو دیکھ کر رُک جاتی ہے۔

میرے دوست نے آہستہ سے کہا۔ میں اور وہ کئی بار اُن کھرنی کے مدور سایوں میں ایک دوسرے کے ہات کے ہات میں دیئے گھومتے رہے ہیں۔۔۔ کتنی ہی جنم اشٹمیاں اس طرح گزر گئیں۔۔۔ اور آج۔۔۔۔!

میں خاموش رہا۔

چند دن ہوئے میرا دوست کہہ رہا تھا۔ مجھے قتل کے ایک مقدمے میں پیش ہونا پڑا۔ قاتل کو مقتول کی بیوی سے محبت تھی۔۔۔۔ اور جب اسے پھانسی کا حکم سنایا گیا تو قاتل کسان نے جن حسرت بھری نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں کی وارفتگی اور گرسنگی ابھی تک میرے دل میں تیر کی طرح چبھی جاتی ہے۔

وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ سالہا سال ایک دوسرے سے پیار کرتے رہے۔ پھر لڑکی کے ماں باپ نے اس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی۔۔۔۔ یہ جمنا پر لوگ محبت کے دیئے کس لیے جلاتے ہیں؟۔۔۔ بڑے ہو کر اپنے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کے گلے پر کس طرح چھُری چلاتے ہیں۔۔۔ وہ کسان عورت اب پاگل خانے میں ہے۔۔۔۔؟

میں نے کہا محبت بھی اکثر بے وفا ہوتی ہے۔ رادھا کو کرشن سے عشق تھا لیکن رادھا اور کرشن کے درمیان بادشاہت کی دیوار آگئی، اس نے کہا شاید تمہیں رادھا اور کرشن کی محبت کا انجام معلوم نہیں۔"

"نہیں" وہ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر آہستہ سے کہنے لگا۔۔۔

.... کرشن جی نے برندا بن کی گوپیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر برندا بن میں آئیں گے اور ہر ایک گوپی کے گھر کا دروازہ تین بار کھٹکھٹائیں گے جس گھر میں روشنی ہوگی اور جو گوپی دروازہ کھٹکھٹانے پر ان کا خیر مقدم کرے گی۔ وہ اُسی کے عشق کو سچا جانیں گے ــ اس بات کو کئی برس گزر گئے۔

ایک اندھیاری طوفانی رات میں جب بجلی کڑک رہی تھی اور بارش موسلادھار برس رہی تھی کسی نے برندا بن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے سیاہ لبادے میں لپٹا ہُوا اجنبی ہر ایک مکان پر تین بار دستک دیتا، اور پھر آگے بڑھ جاتا .... لیکن سب مکانوں میں اندھیرا تھا۔ سب لوگ سوتے پڑے تھے۔ کسی نے اُٹھ کر دروازہ نہ کھولا۔

اجنبی نا اُمید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ دور۔ ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے۔ وہ اس جھونپڑی کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا۔ لیکن اسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی کیونکہ دروازہ کھُلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں، رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے۔ چہرے پر لاتعداد جھُریاں۔

کرشن جی نے گلوگیر آواز میں کہا۔" رادھا میں آگیا ہوں "

لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی۔ دیئے کی لَو کی طرف تکتی ہُوئی۔

رادھا میں آگیا ہوں، کرشن جی نے چِلا کر کہا۔

لیکن رادھا نے کچھ نہ دیکھا۔ نہ سُنا۔ اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اس کی

آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں اور کان بہرے۔

۔۔۔ زندگی سے پہلے، موت سے پہلے، انصاف سے پہلے ۔۔۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا دوست اپنی باہوں میں سر چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ جیسے کسی نے اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو جیسے پاگل عورت محبت کرنے کے جرم میں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دی گئی ہو۔ زرد رو لڑکی دشرام گھاٹ پر حسرت بھری نگاہوں سے مٹی کے دیوبل کی لو کی طرف تک رہی تھی اس کی حیران پتلیاں میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں۔ اندھے سادھو سر منڈائے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور کھڑتالیں بجاتے ہوئے گا رہے تھے۔ رادھے شیام۔ رادھے شیام۔ رادھے شیام —
لیف رائٹ۔ لیف رائٹ۔ لیف رائٹ۔ پرانے خدا ابھی تک مندروں، بینکوں فیکٹریوں اور کھیتوں پر قبضہ کئے بیٹھے تھے، وہ اپنے بہی کھاتے کھولے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اُن کی ننگی توندوں پر جینو لہرا رہے تھے اور وہ نہایت دلچسپی سے اُن لاکھوں آوازوں کو سن رہے تھے، جو فضا میں چاروں طرف شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں ۔۔۔ رادھے شیام ۔۔۔ رادھے شیام ۔۔۔"

چڑیا کا غلام

اُس کے لانبے قد سے نہ صرف اس کی بیوی کو کوفت ہوتی تھی، بلکہ شہر کے مکان، چھتنیں، دروازے تک اُس سے نالاں تھے۔ اگر اس لانبے قد کے ساتھ اس کا جسم بھی متناسب ہوتا تو خیر ایک بات تھی۔ لیکن اس کے جسم میں گوشت پوست ہڈیاں وغیرہ یعنی انسان کے دیگر اجزائے ترکیبی مقدار میں اس قدر کم تھے کہ چلتے وقت وہ بانس کی ایک ایسی لمبی پتلی شاخ نظر آتا جس کے سر پہ دو آنکھیں بندھی ہوں۔

اُسے اپنی آنکھوں پہ بڑا ناز تھا۔ بڑی بڑی لونگی آنکھیں، لیکن اس کے جسم کو دیکھ کر اس کے متناسب اعضا کا جائزہ لیتے ہوئے ہر فرد کو یہی گمان ہوتا تھا کہ ہو نہ ہو اس شخص نے کسی کی آنکھیں چرا کر اپنے چہرے پہ لگا لی ہیں۔ کس قدر عجیب معلوم ہوتی تھیں وہ آنکھیں۔

آج اُس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا تھا۔ سفید ڈک کی پتلون پہنی

ہوئی تھی اور اس کے جسم کی چوٹی پر ایک سیاہ فیلٹ نمایاں تھی۔ دُور سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بجلی کے کھمبے پر کوّا بیٹھا ہے۔ اس ہیئت کذائی میں جس کی بوالعجبی کا اُسے مطلق احساس نہ تھا وہ اپنی انگلو انڈین محبوبہ کے مکان گیا جو مان اسٹریٹ کے جنوبی چوک میں دائیں سڑک کی پہلی بائیں گلی کے دوسرے دائیں گھر میں رہتی تھی (اب بھی وہیں رہتی ہے اس لیے میں نے پُورا پتہ لکھ دیا ہے کہ شاید کبھی آپ ۔۔۔۔) جینی جوانی کی حدود سے گزر کر ادھیڑ پنے میں جا رہی تھی اور پھر دن رات، شراب، سینما، ناچ، گورے یا کبھی کبھار اُس کا ہندوستانی عاشق جب کبھی اس کا ہندوستانی عاشق اس کے گھر آتا تھا۔ محلّے کی کرسٹان کالی کلوٹی چھوکریاں اُسے تین چار دن تک بہت پریشان کیا کرتی۔ جینی تمہارے نیٹیو محبوب کا کیا حال ہے؟ کیسا ہے وہ۔

وہ آج بہت خوش تھا، پہلی تاریخ تھی، جیب میں سکّے کھنکھنا رہے تھے اور دس روپوں کے نئے نوٹ اپنی مخصوص خوش آیند آواز پیدا کر رہے تھے، وہ آج اپنی محبوبہ کے ساتھ کسی ٹول میں پکچر دیکھے گا ۔۔۔ ہر عشقیہ سین پر اس کا بوسہ لے گا ۔۔۔۔ اور اتنے ہی بوسے لے گا جتنے اس تصویر میں لیے گئے۔ اس کے بعد وہ پی کنگ چینی رسٹوران میں دھنیا، پیاز، گاجر اور کبرٹوں کو ٹکڑوں کی ملی جلی بھجیا اڑائیں گے ۔۔۔ پران وافو فر ۔۔۔ اور پھر ۔۔ پا ٹرڈی لو کان ۔۔

یہ چینی باورچی کتنے ہوشیار ہوتے ہیں۔ جو اشیا خوردنی ہم نکمی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ انہی چیزوں سے یہ ایسی خوب صورت خوش ذائقہ پکوان تیار کرتے ہیں کہ چوگنے دام دینے پر بھی تسلی نہیں ہوتی ۔۔۔ جو بالکل نہیں گھبراتا ۔۔

وہ جیب اس طرح اپنے حسین سپنوں سے کھیلتا ہُوا، آپ ہی آپ مسکراتا ہُوا گلی کے اندر گھوم کر دوسرے دائیں گھر میں داخل ہُوا تو اُس نے دو کرسٹان چھوکریوں کے قہقہوں کی آواز سُنی، وہ دو ٹامیوں کے بازوؤں سے لگی ہُوئی چلی جا رہی تھیں، کالے کالے پاؤں میں اونچی ایڑی کے سفید جُوتے کیا بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ۔ ۔ اسے دیکھ کر بولیں۔ ۔ جینی کا نیٹو محبوب ہی ہی ہی۔ ۔ ۔ ۔ جینی۔ ۔ ۔ ۔

جینی نے یہ آوازے سُن لیے۔ وہ پی رہی تھی اور غصّے میں تھی، یہ نوجوان لڑکیاں پیارے پیارے سُرخ و سپید ٹامیوں کو لیے ہُوئے چلی جا رہی تھیں اور آج اس کی قسمت میں۔ ۔ ۔ ۔

"جینی!" بانس کی شاخ نے نہایت پیار سے کہا۔

جینی رخصت لیے ہُوئے تھی۔ آنکھیں لال، چہرہ سوجا سوجا سا۔

وہ حیران رہ گیا — جینی کیا بات ہے؟

ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

اُس نے جیب میں سے روپئے نکالے مسکرا کر کہنے لگا۔ ۔ ۔

بھول گئیں؟ آج پہلی تاریخ ہے، پکچر! پی کنگ۔ ۔ ۔ پھر بند گارڈن کی سیر اور۔ ۔ ۔ ۔

جینی نے روپئے اور نوٹ اٹھا کر اپنی بلاؤز میں ڈال لیے، بولی دفع ہو جاؤ۔ میں آج تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی!"

کیوں ڈارلنگ؟

وہ اس کی بلائیں لینے لگا۔

اچھا دیکھو ڈارلنگ — یکایک جینی نے نہایت مسکین لہجے میں کہا، تم گھر چلے جاؤ۔ یہ آنکھوں کا سُرمہ دھو ڈالو۔ یہ سپید ڈک کی پتلون تبدیل کر آؤ اور یہ کالی ہیٹ بھی۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ اس لباس میں۔۔۔ تم بالکل چڑیا کے غلام معلوم ہوتے ہو۔'

یہ کہہ کر جینی نے دونوں ہات اپنے کولہوں پہ رکھ لیے اور بے تحاشا ہنسنے لگی۔

مان اسٹریٹ میں سیمنسر و کیمنسر و اینڈ سیمنسر و کی دکان میں نئے کھلونے آئے تھے۔ دو چھوٹے لڑکے نمائشی دریچے کے شیشے سے اپنا چہرہ لگائے حیرت سے اس کھلونے کی طرف دیکھ رہے تھے جو دریچے کے اندر ایک لکڑی کے اسٹول پر کھڑا دائیں بائیں سر ہلاتا جاتا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

ایک لڑکے نے کہا — یہ کھلونا میں لوں گا۔

دوسرا بولا — نہیں، یہ کھلونا میں لوں گا۔

پہلے لڑکے نے کہا تم کیسے لو گے؟ کیا تمہارے پاس سات رنگوں والا بنٹا ہے، یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں سے وہ بنٹا نکالا اور اپنی ہتیلی پہ رکھ کر دوسرے لڑکے کو دکھانے لگا۔

دوسرے لڑکے نے اپنی جیب میں ہات ڈالا اور پھر اس کی آنکھوں کے قریب لے جاکر اپنی مٹھی کھول دی، اور اس کی ہتیلی پہ بالکل ایک ایسا ہی خوبصورت بنٹا چمک رہا تھا۔

پہلا لڑکا بولا۔ میرے پاس لوہے کی چھ انچ لمبی کیل ہے۔ یہ دیکھو

دوسرے لڑکے نے کہا۔ میرے پاس سیپ کا چاقو ہے۔ یہ دیکھو۔

پہلے لڑکے نے کہا۔ تمہارے باپ کی ناک ٹیڑھی ہے۔

دوسرے لڑکے نے کہا۔ تمہارا باپ گلی کا مہتر معلوم ہوتا ہے۔۔۔

اور ان دونوں نے وہیں لڑنا شروع کر دیا۔

وہ چیخنے چلّانے اور رونے لگے۔ لوگ اکٹھے ہونے لگے، اتنے میں ان لڑکوں کی مائیں بغل کی دکان سے باہر نکل آئیں اور ایک دوسری سے لڑنے جھگڑنے لگیں، تیرے لڑکے نے میرے لڑکے کو پیٹا۔ نہیں تیرے لڑکے نے میرے لڑکے کو گھونسا دکھایا۔۔۔ تو کہاں کی نواب زادی بن کر آئی ہے؟ دونوں عورتوں نے وہ شور مچایا، وہ شور مچایا کہ سارا راستہ بند ہو گیا، پولیس کا سپاہی جو جھگڑا چکانے آ رہا تھا راستے میں ملٹری کے ایک سپاہی سے اُلجھ پڑا، ملٹری کے سپاہی نے اُسے ایک بھرپور گالی دی۔ پولیس والے نے ڈنڈے کا ایک بھرپور وار اس کے سر پر رسید کیا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے، ٹانگے۔ موٹریں لاریاں دونوں طرف رُک گئیں۔

ایک پبے کارڈ والا۔ ارے اپنے اس سالے شورے کے چھکڑے کو آگے نکال۔

دوسرا ڈرائیور بولا۔ ابے دیکھتا نہیں، راستہ بند ہے۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ نئی گاڑی کو چھکڑا کہتا ہے اور اس اپنے پُرانے نکمے ماڈل کو نہیں دیکھتا پتہ نہیں کس کباڑیئے سے پُرانے پُرزے لے کر موٹر کھڑی کر لی ہے!

تجھے موٹر کھڑی کرنے کا مزہ چکھاؤں ؛ پے کارڈ والا بولا۔ ہات توڑ نگا، ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔ سالہ سرمایہ دار ہوگا، اپنے گھر ہوگا ! دوسرے نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ سالے۔ حرام زادے !

وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے، ان دونوں کو لڑتے دیکھ کر دو تین آدمی لڑائی بند کرانے کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن پھر فطری طریق پر خود آپس ہی میں الجھ پڑے۔ گھونسے، طمانچے، تو تو میں میں، شور و غل، ہاتھا پائی۔

سڑک کے کنارے پان والے کی دکان کے قریب ایک ٹھنگنا، موٹا آدمی ایک لمبا سگار منہ میں لیے نہایت اطمینان سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک نہایت دبلا بدصورت آدمی اُس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا، اس نے سفید پتلون پہنی ہوئی تھی اور کالی ہیٹ اس کے سر پر رکھی ہوئی تھی۔ سگار والے خوش پوش آدمی نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر بہ اندازِ تنفر اپنی توند دوسری طرف پھیر لی۔

چند لمحوں تک وہ دونوں وہیں چُپ چاپ کھڑے رہے اور شور و غل بڑھتا گیا، پھر یکایک ایک تیز گھونسا موٹے آدمی کی توند پر پڑا اور اس کا سگار منہ سے نکل کر موری میں جا پڑا۔ موٹے آدمی کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا، اور وہ حیرت سے دیکھنے لگا کہ وہی دبلا پتلا آدمی آستین چڑھائے اُسے پیٹ رہا ہے اور دانت پیس پیس کر کہہ رہا ہے۔۔۔ مجھے چڑیا کا غلام کہتا ہے، سالے۔ میں

چڑیا کا غلام ہوں اور تو کون ہے بدمعاش، میں تجھے ابھی چڑیا کا غلام ... !"
کیمنسر و کیمنسر و اینڈ کیمنسر و کی دکان کے نمائشی دریچے میں وہ کھلونا —
اسٹول پہ کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اور سر ہلا رہا تھا۔ دائیں بائیں ....
دائیں بائیں .....

مثبت اور منفی

چند دائرے نیلے پیلے لال، گلابی، نارنجی، ارغوانی، میں نے کہا شاہد بھیا وہ مسکرائے، مرزا صاحب سر کھجانے لگے، شفق دُور ہوتی گئی اور سمندر کا پانی چیخنے لگا، کنہیا لعل، کنہیا لعل۔ تم بڑے گدھے ہو، مرزا صاحب سر کھجانے لگے۔ کالے کالے بالوں نے بدنما کرنجی پھوڑوں کو چھپا لیا تھا، اور پھر چاروں طرف فضا میں تارے فواروں کی طرح قہقہے لگانے لگے، اور موسیقی کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر جب برف گرنے لگی، تب بھی شاہد بھیا مسکراتے رہے اور برف کے گالے بظاہر سپید، لیکن کس قدر نفیس، نازک نقش، ایسی پچی کاری تو تاج محل میں بھی موجود نہ تھی، درزیں، سنولا پن، اور پھر تاج کے سامنے ایک اور کالا تاج بننا شروع ہوا تھا، اور صدیوں کے بعد، کئی صدیوں کے بعد تاج کے گنبد کے گرد لکڑی کے بڑے بڑے کھمبے سر بلند کیے ہوئے نظر آئے، شاہجہاں کسی بنگالی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر میں بسترِ مرگ پر پڑا تاج کو دیکھ رہا تھا۔ وہ

تاج جس کے گرد لکڑی کے بڑے بڑے بدنما کھمبے گڑے تھے، اسے ممتاز محل نظر نہ آتی تھی، حکیم غائب تھے۔ ایک مغلانی سر دابنے لگی، مرزا صاحب بڑبڑانے لگے، اُف رے، اِن بالوں میں کس قدر کھجلی ہوتی ہے۔ یہ بھورے بھورے پکتے ہوئے پھوڑے۔ شامی کبابوں کی بُو اس کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ شاہد بھائی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور یکایک لال لال لاوا اُس کے قدموں میں بہنے لگا اور اس نے چیخ مار کر اپنے پاؤں پرے ہٹانے چاہے، لیکن لاوا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور لاکھوں اور کروڑوں چیونٹیاں رہگذار میں رینگتی ہوئی چلی جا رہی تھیں، اور وہ کسی بڑے ملک کے دیو کی طرح ایک طرف کھڑا اس ننھی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان چیونٹیوں کے گھر تھے، بیوی بچے، غلام، اوسط درجے کی حیوانی تہذیب کے سارے لوازم، اور اُس نے گھبرا کر اپنا پاؤں رہگذار میں رکھ دیا اور در جنوں غالباً سینکڑوں چیونٹیاں چشم زدن میں اس کے پاؤں تلے کچلی گئیں پاؤں کا بوجھ، یا کرِ قسمت، یا کرِ مثبت اور منفی کا عملیہ یکایک زندگی موت کے دروازے میں پا بجولاں نظر آئی، اور شیطان قہقہے لگا رہا تھا اور سمندر کا پانی چاروں طرف پھیلتا گیا، پھولے ہوئے سفید سفید بادبان، جیسے نذیر کے نتھنے، اور وہ جمائی لینے لگا، اور شاہد مسکرانے لگے، یہ مسکراہٹ اسے بار بار ٹوک دیتی، مٹیالی سی مسکراہٹ جو بڑھتی جا رہی تھی، اب اسے اس مسکراہٹ میں لال، پیلے، نیلے، گلابی، نارنجی، ارغوانی دائرے گھومتے ہوئے نظر آئے، اور مرکزِ نگاہ سیاہی مائل ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ یہ سیاہی پھیلتی پھیلتی یکایک پھٹ گئی اور تاروں کے جھرمٹ میں چاند کا جھولا نظر آیا اور اندر نے اپنا تخت چھوڑ کر اہلیا کے نرم اور گداز بازوؤں میں پناہ لی۔

رہگذار پر اب صرف ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا، اور چونٹیوں کی ایک کالی سی لکیر اس کے قریب سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی، رام اور لکشمن دونوں اس پتھر کے قریب پہنچے تو پتھر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میرا قصور معاف کر دیجئے۔ میں عورت ہوں۔ میرا نام اہلیا بائی ہے۔ میں رشی پتری ہوں، مجھے راجہ اندر نے ورغلایا تھا، رام نے مسکرا کر اپنا پاؤں پتھر پر رکھا اور کالے کالے بالوں کی لٹیں ان کنول کی طرح پاکیزہ پاؤں سے لپٹ گئیں، اور چونٹیاں زور زور سے چیخنے لگیں، اے رام، تم نے ایک پاؤں کی جنبش سے اہلیا کو زندگی بخشی، لیکن دوسرے پاؤں سے درجنوں چونٹیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا "۔ مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، عورت اور مرد، سفیدی اور سیاہی، خوشی اور غمی، زندگی اور موت، نیکی اور بدی، عقل اور بیوقوفی، ہو سکتا ہے کہ جس کو ہیں نے عقل سمجھا ہو، وہ بیوقوفی ہو، جو بدی ہے، وہ دراصل نیکی ہے۔ جو موت ہے وہ دراصل زندگی ہے۔ کنہیا لال کا زرد چہرہ یکایک کھل اُٹھا۔ اس نے زور سے کہا، تم نرے گدھے ہو، شاہد بھائی مسکرانے لگے مرزا صاحب سر کھجانے لگے، ریگستان میں وہ حجازی ابھی تک نماز پڑھ رہا تھا۔ اور اس کا اونٹ ابھی تک مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاہجہاں کی آنکھیں بند ہو گئیں، اور جمنا کی آغوش میں تاج کا مرمریں گنبد ایک کنول کے پھول کی طرح درخشاں نظر آیا۔ لہروں میں بھنور پیدا ہوا، اور پھول نے رقص کرنا شروع کیا، جھلک حیران، لرزاں، بھئی خوب کیا شعر کہا ہے۔ واللہ، بیت الغزل،

"تیرے لئے جہان میں چین ہے نہ قرار ہے"

پیانو پر بلی بیٹھی ہوئی خُرخُر کر رہی تھی، آجانا مانو بلی، ملائم سمور جیسے عورت کی

جلد، تیز ناخن جیسے عورت کی فطرت، ناخن سمور میں چھپے ہوئے، پالش کیے ہوئے ازلی، ابدی، دوامی، مستقل پالش، جو پالش سے بے نیاز ہو وہ عورت ہی نہیں جو بیک وقت چھ عاشقوں سے محبت نہ کر سکے وہ حسین نہیں، جو کبھی چوہا ہی نہ پکڑ سکے اُسے بلّی کون کہے گا، میاؤں میاؤں، آجا مانو بلّی۔ بلّی اُچک کر سبز مخمل سے منڈھی ہوئی کرسی پر جا بیٹھی، اور پیانو کے سُر۔ ۔ ۔ زور سے بج اُٹھے: تا را را لا را را ری۔ ۔ ۔ ۔ فضا میں پرواز کرنے لگے۔ بطخوں کی طرح وہ اپنی چونچوں سے فضا کے جسم کو زخمی کر رہے تھے، اور خوشی سے چلّا رہے تھے۔ میں اُن کو اور فضا کے گہرے گھاؤ کو دیکھنے لگا۔ اختیار، تسلسل، مزاحمت اور زخم، مثبت اور منفی، کہربائی رَو ۔ پپ پپ پپ برقی رو حرکت کرنے لگی، اور آواز کے نشتر فضا کے جسم میں برمے کی طرح سوراخ کرتے گئے، میں دودھ پیتا مجنوں نہیں، مجنوں نے کہا، اور چاقو سے اپنا سینہ چھید ڈالا، اور لہو کی دھار ریگستان میں بہہ نکلی، سوئے حجاز نہیں، سوئے مراکش نہیں، کوئے لیلےٰ، محمل سجا ہوا جو بعزم سفر ہے۔ آج مجنوں کمبخت اگر کشمیر میں پیدا ہوا ہوتا تو لیلےٰ کا رنگ سیب کی طرح سُرخ ہوتا۔ ایک ہرے رنگ کے طوطے نے نذیر کے نتھنے میں گھس کر کہا، ٹیں ٹیں۔ سٹ پٹ۔ پہنچی چیز سبحان سب کا داتا، نذیر نے زور سے چھینک ماری اور حیران ہو کر کہا، سبحان تیری قدرت اور شریر طوطا ایک سبز قینچی کی طرح اپنے پر پھیلا کر شہتوت کی ڈالی سے لٹک گیا، مرجھائے ہوئے، گلے سڑے شہتوت بکھرے پڑے تھے، اور بھنگن کی چھوٹی لڑکی انہیں چُن چُن کر کھا رہی تھی، خاک اُس کے ہونٹوں سے لگی ہوئی تھی، اور گھاس کے تنکوں پر شبنم کے موتی سوئے ہوئے تھے۔ ایسے بے سُدھ کہ نہ وہ طوطے کی چیخیں

سُن رہے تھے، نہ مُرجھاتے ہُوئے شہتوت کے لوٹے اور لڑکی کے لبوں پر مٹی لگی ہُوئی تھی، اور وہ مٹی میں سنے ہُوئے شہتوت کھا رہی تھی، کیونکہ مکھن ایک سپید ٹکیہ میں ملبوس ہو کر ایک چینی کی پیالی میں ڈال کر، ایک چمچے کے ساتھ سُرخ سُرخ پتلے پتلے لبوں میں گھل جاتا ہے، اور غریب لڑکی مٹی میں سنے ہُوئے شہتوت کھا رہی تھی اور غریب بچھڑی چلا رہی تھی، کیونکہ اس کی ماں کے تھنوں میں سے مکھن نکال لیا گیا تھا اور مکھن کھانے والی عورت ایک نہایت لطیف مسکراہٹ سے ایک سپید براق رومال سے اپنے نازک پنکھڑیوں کی طرح پتلے ہونٹ صاف کر رہی تھی، جب ایک لڑکی مٹی کھاتی ہے، جب ایک بچھڑی دن رات بھوکی ڈکراتی ہے تو ایسی دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، اخلاق بولا۔ واہ کیا شعر کہا ہے۔ خوب کہا ہے ہے۔ مکرر ارشاد لیکن شاہجہاں مر چکا تھا اور اس کے بیٹے تخت و تاج کے لیے آپس میں جھگڑ رہے تھے، اور زمین اور آسمان گلے ملنے لگے، اور کائنات تنگ ہوتی گئی، اور اندھیرا چاروں طرف بڑھتا گیا، اور زمین اور آسمان دونوں طرف سے آگے بڑھ رہے تھے اور بیچ میں ایک تنگ سی گلی بن گئی تھی، اور یہ گلی ہر لحظہ تنگ ہوتی جا رہی تھی، اور خوف سے اس کا دم گھٹنے لگا، اور شیطان کا سایہ چاروں طرف پھیل گیا تھا اور روشنی کی ایک پتلی سی لکیر رہ گئی تھی اور تاریکی دونوں طرف سے برابر بڑھتی آ رہی تھی، اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ یقیناً پس جائے گا، تاریکی کے مہیب قدموں میں چیونٹی کی طرح کچلا جائے گا۔ پن چکّی کے پاٹوں میں گندم کے آخری دانے کی طرح تاریک بھنور میں زندگی کے آخری تنکے کی طرح، اور اُس

نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تاریکی چاروں طرف چھا گئی، اور ہر طرف اُجالا ہی اُجالا ہو گیا، اور موسیقی کا سمندر اس کی نرسی ہوئی رُوح کے گوشے گوشے میں لہریں لینے لگا، جیسے کائنات کا غیر مرئی ہاتھ اس کا ماتھا چوم رہا تھا۔ جیسے وہ خود گھاس کے تنکے پر سوئے ہوئے شبنم کے آخری قطرے کی طرح تھا، اور سورج کی پہلی کرن اُسے دعوتِ نظارہ دے رہی تھی، اور اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اسے اپنے ظاہر میں اور اپنے باطن میں اور چاروں طرف ایک دھنک تنی ہوئی نظر آئی۔ اس قوس و قزح میں ہزاروں رنگ تھے۔ لاکھوں قہقہے، کروڑوں مسرتیں پانی کے بُلبلے ایک دوسرے کو ریتلے، پیلے ڈھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، اور چیونٹیوں کی قطار اک گول دائرہ بن گئی، اور تسبیح کے اس دائرہ میں لاکھوں بُلبلے گندھے ہوئے تھے، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، نیم دروں، نیم بروں، ڈھاکے کی ململ اور تانبے کی دیگ میں ایک اُبلا ہوا انسان، یا اللہ یہ بادشاہت کیا کچھ کراتی ہے۔
یا اللہ یہ محبت کیا کچھ دکھاتی ہے، انسان بھی آلو کی طرح اُبالا جا سکتا ہے۔ آلو میں بھی نشاستہ ہوتا ہے اور انسان کے جسم میں بھی، پھر وہ لوگ جو آلوؤں کی جگہ انسان اُبال کر کھاتے ہیں، کیونکہ گردن زدنی ہیں، جو نیکی ہے وہ بدی ہے جو بدی وہ نیکی ہے۔
نیکی کہاں ہے، بدی کیسی ہے۔ آلو یا انسان؟ لہو کی ندیاں اور سلاخوں پر آنتیں اور ایک پھٹا ہوا پُرزہ، میری ماں، میری پیاری اماں، میں راضی خوشی ہوں میرے بچے میں ہمیشہ تیرے لیے دعا کرتی ہوں۔ پیارے بھیّا، تم سدا جیتے رہو، میرے مالک تیرا بیٹا اب دو برس کا ہو گیا ہے اور تجھے ابا۔ آ جا ابّا۔ کہہ کر پکارتا ہے، اور کاغذ کا پُرزہ ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ ہوا کے سینے میں شگاف

پیدا کر دیتا ہے اور ہوا چلاتی ہے' اور ہوا چلاتی ہے' اور ایک وحشیانہ' اندھے جوش سے مدافعت کرتی ہے اور ہوا چلاتی ہے اور ایک وحشیانہ' اندھے جوش سے مدافعت کرتی ہے اور کاغذ چھلنی ہو جاتا ہے' اور بیوس گن کی تڑا تڑ، اور کمانڈر کہتا ہے۔ آگے بڑھو، بہادر سپاہیو! اور دشمن کا سینہ چھلنی کر دو۔ یہ کس کا سینہ ہے؛ تمہارا یا میرا۔ یہ سینہ جس میں سے لہو کی دھار بہہ رہی ہے۔ یہ ایکس رے کی مشین ہے یا بیوس گن' اے فولاد کی دنیا، اپنے قدموں کے مہیب سایوں میں انسانی چیونٹیوں کی رینگتی ہوئی قطار دیکھ۔ اس کا نوحہ سُن۔ اس کے کچلے ہوئے اجسام دیکھ' قطار اندر قطار، جیسے کالے کالے' نیلے نیلے' پیلے پیلے پیرہن' اور دائرے بڑھتے چلے جا رہے ہیں' اور تاج کا عکس جمنا کے فرشِ آب پر رقص کر رہا ہے رقصاں، حیراں' لرزاں' صدیوں کی سطوت اس کی آنکھوں میں کھلی ہوئی ہے' اس کی زلفوں میں بسی ہوئی ہے' ملبوسات میں رچی ہوئی ہے۔ کاش تجھے دیمک کھا جائے' تیرا مرمریں آئینہ آنسو بن کر جمنا کی آنکھ سے ڈھلک پڑے' تیرا اس فولاد کی دنیا میں کیا کام، جا اپنی روئی ہوئی محبت کی داستان اُس رُوح کو سُنا، جس کی ابھی تخلیق نہیں ہوئی۔ اس زمانے کو دکھا جو ابھی آیا نہیں' اس تہذیب پر عیاں کر جو ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ جاتی نہیں لگاؤں ہنٹر؟ واللہ طبیعت پھڑک اُٹھی اُستاد کیا داؤں مارا ہے۔ موتی چوُر سے زبسکو کو گرایا ہے' پہلوان ہو میاں، جسم میں نشاستہ زیادہ ہے' یعنی آلو یت نشاستہ تو سنگِ مرمر میں بھی بہت ہوتا ہے۔ تو گویا تاج بھی نشاستہ کا ایک ڈھیر ہے۔ آلو یت کا مظہر کاش شاہجہاں سنگِ مرمر کے بجائے آلو کا تاج بناتا تو اس سے محبت کی تضحیک ہو جاتی، محبت میں اور

نشاستہ میں وہی نسبت ہے۔ جو موت اور زندگی میں، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، کیوں جھگڑا کرتے ہو جی۔ ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی، ہندوستان اور پاکستان۔ مثبت اور منفی، مثبت اور منفی لہریں بھاگتی ہوئی جا رہی ہیں۔ ہر لہر کی رفتار ہوتی ہے۔ ہر رفتار میں حرکت ہوتی ہے۔ ہر حرکت مارے کو زخمی کرتی ہے۔ اگر ایک چیز آگے بڑھتی ہے تو دوسری چیز پیچھے ہٹتی ہے۔ اگر ایک شئے گرم ہوتی ہے تو دوسری ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ وہ تاریک ہو جاتی ہے تو یہ روشن ہو جاتی ہے۔ وہ مر جاتی ہے تو یہ زندہ ہو جاتی ہے بابر اور ہمایوں، مثبت اور منفی بادشاہت اور رعایا، تارے دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سوکھی آنکھوں میں لوٹنے لگے۔ یا اللہ نیند کیوں نہیں آتی۔ ساری دنیا سو رہی ہے کیا اس لیے مجھے نیند نہیں آتی، بلبلیں چہچہا کر خاموش ہو گئیں، پھول نے دن بھر چہک چہک کر اپنی پنکھڑیاں پتوں کی آغوش میں ڈال دیں۔ اب وہ ٹہنی سے لگا سو رہا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کے کندھے سے۔ پیارے پیارے ننھے منے پھول۔ مجھے اپنے سینے کی دھڑکن میں چھپا لے، اپنی خاموش موسیقیت کی گہرائیوں میں گم کر لے۔ تجھ پر ساری کائنات کی مسرتیں نثار، میں تیرے سائے تلے اپنی پلکیں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ تاکہ صبح میں ان ستاروں کو دیکھ سکوں، جو سورج کی آمد سے پہلے دبے قدموں تیرے حضور میں آتے ہیں، اور تجھے شبنم کی مالا پہنا جاتے ہیں۔ سو رہا ہے تو آرام اور سکھ کی نیند سو، تیرے سائے تلے بھی میری پلکیں حیران ہیں۔۔۔۔ آنکھیں خشک ہیں، اور کان کونپلوں کے نغمے

کو سُن رہے ہیں۔ فولاد نے اک نئی موسیقی پیدا کی ہے رجب کلیجے چھلنی ہوتے ہیں تو نغمہ اُبلتا ہے۔ جب غریب کی مٹی میں سنے ہُوئے پھل کھانی ہے۔ تو میری محبوبہ کے لبوں پر تبسم کھیلتا ہے، اور تازہ معصوم پھُول تو اس تضاد سے آگاہ نہیں، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی ----- دھم دھم نارے ہی تارے۔ لہریں ہی لہریں، تاریکی، سمندر، کچھ بھی نہیں ----

جھیل سے پہلے جھیل کے بعد

جو سڑک سری نگر سے گل مرگ کی طرف جاتی ہے۔ وہ دو رویہ شمشاد کے خوبصورت پیڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ سڑک دھان کے کھیتوں کے بیچ میں سے گذرتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کی نرم روندیاں دھان کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی بہہ رہی ہیں۔ کھیتوں کے کنارے جہاں کہیں پانی کھڑا ہے یا چپّا بھرتا تھم سا گیا ہے وہاں کنول اور مکھن پیالے کھلے ہوئے ہیں، سپید، گلابی، زرد۔ کہیں کہیں چناروں کے نیچے گڈریئے گائیں بھیڑ بکریاں چرا رہے ہیں، چار چار عورتوں کی ٹولیاں گیت گاتی ہوئی دھان کوٹ رہی ہیں... ایک عورت سر پر گھڑا اٹھائے پانی بھرنے جا رہی ہے۔ لاری کو دیکھ کر یوں ہی بلا وجہ ہنس پڑتی ہے۔ اس کے موتیوں سے سپید دانت بہت عرصہ تک آنکھوں میں، پھر تخیّل میں لرزتے رہتے ہیں۔

جو سڑک ٹنگ مرگ سے گل مرگ کو جاتی ہے وہ صرف تین میل لمبی ہے

اس سڑک پر انگریز مرد اور عورتیں عمدہ گھوڑوں پر سوار نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھوری رنگت والے کشمیری ہانپتے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں، کسی کے ہاتھ میں ٹوکری ہوتی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تھرماس تو کسی کی گردن پر کسی میم صاحب کا بچہ مرد تسمہ پا کی طرح سوار ہوتا ہے۔ مزدور اپنی کمر پر ڈھائی من کا اسباب اُٹھائے جھکے ہوئے چڑھائی چڑھتے جاتے ہیں۔ وہ پنچایت والوں کے وہ مقولے نہیں پڑھ سکتے جو ٹنگ مرگ میں آتشک اور سوزاک کی دوائیوں کے اشتہار کی طرح جا بجا لگے ہوتے ہیں "مزدوری میں عزت ہے"! مزدوری سے عار نہ کرو، مزدوری کرنا سیکھو"۔ اس سڑک کے دو رویہ چیل اور دیودار کے تناور درخت ہیں۔ جن کے پاؤں میں سفید چھتریاں اور کھمبیں اُگی ہوئی ہیں، بنفشے کے پھول ہیں، سر پڑی کا سبزہ اور کسی دیودار پر شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے ہیں، اور سارا جنگل ان کی مدھم آواز سے گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس شہد میں جنگلی پھولوں کی حلاوت ہوتی ہے اور وہ مقوی وٹامن جسے تیار کرتے وقت ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔

دو ننھے کشمیری لڑکے اس سڑک پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ گل مرگ سے تھکے تھکے قدموں سے چل رہے ہیں، شاید گھر پہنچ کر ماں باپ بھی ناراض ہوں گے۔ شاید کھانا نہ ملے۔ صرف چانٹے ہی ملیں۔ سڑک کے نیچے بہت دُور تک شور مچاتا ہوا فیروز پور نالہ بہہ رہا ہے۔ نیلا پانی جس میں سفید سفید جھاگ ملی ہوئی ہے، نیلا جیسے ان کشمیری لڑکوں کی آنکھیں سفید سفید جیسے لاری کی طرف دیکھتی ہوئی کشمیرن کے دانت، لیکن انڈے پھر بھی نہیں بکے۔

دس بارہ کشمیری لڑکیاں پیالی نما ٹوکریوں میں جنگل سے لکڑیاں اُٹھائے آ رہی ہیں۔ ان بڑی بڑی ٹوکریوں میں وہ ٹنگ مرگ کے رہنے والے سیاحوں اور تپِ دق کے مریضوں کی طرح کھانس رہی ہیں، کیونکہ لکڑیاں اٹھاتے وقت جسم جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ ان لڑکیوں کی ٹانگیں بچپن ہی سے بھر کر بے ڈول ہو جاتی ہیں۔ چال میں ناہمواری، رخساروں میں گڑھے اور چھاتیوں میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں کبھی جوان نہیں ہوتیں۔ پہلے تو محض لڑکیاں ہوتی ہیں اور پھر ایک دم مائیں بن جاتی ہیں۔ جوانی کیا ہے۔ رس کیا ہے۔ جنگل میں شہد کی مکھی کس لیے پھولوں کی حلاوت جمع کرتی ہے۔ کنول کیوں مسکراتے ہیں کمھن پیالوں کی زرد زرد پتیاں ملتے ہوئے پانی کیوں لرزاں رہتے ہیں۔ انہیں ان باتوں کی سمجھ نہیں۔

جو سڑک نو ہزار فٹ کی بلندی پر گل مرگ کی وادی کے پیالہ کے گرد ایک زرکار فیتے کی طرح گھومتی جاتی ہے، اسے سرکلر روڈ کہتے ہیں۔ یہاں سے سارے کشمیر کی وادی دکھائی دیتی ہے۔ سینکڑوں میل کا وسیع و عریض میدان چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جب کہ ابھی انسان پیدا نہ ہوا تھا، ان پہاڑوں نے ایک نیلی جھیل کو گھیر رکھا تھا۔ چاروں طرف برف کے گلیشیر ہوں گے، اور بیچ میں یہ جھیل۔ جس کے نشان ابھی ڈل، ولر اور مانس بل کی جھیلوں میں ملتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اب بھی وہی پرانی جھیل ہے، وہی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میں ہی وہ پہلا آدمی ہوں، جو

پُراسرار مافوق الفطرت منظر کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر وہ جھیل کا پانی جیسے ایک دم کہیں غائب ہو جاتا ہے اور وادی کا سبزہ اور اس کے مرغزار اور اس کے گاؤں اور شہر آنکھوں کے آگے پھیلتے جاتے ہیں۔ دیوداروں کا سناٹا فیروز پور نالے کے شور سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے اور زندگی ہزاروں سال آگے کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اس سڑک پر میری ملاقات ایک آئرش لڑکی سے ہوتی ہے، نام ہے لیرا اوکانر لیرا کی آنکھیں نہ نیلی ہیں نہ بھوری نہ سبز۔ بلکہ ان تینوں میں ملتا جلتا ہوا کوئی اور رنگ لیرا کی آنکھوں میں ایک عجیب موہنی ہے۔ جیسے یہ آنکھیں ہمیشہ سپنے ہی دیکھا کرتی ہیں۔ لیرا کے بالوں کا رنگ پلاٹینم جیسا ہے۔ نازک، مہین، ریشمیں، ان کے گرد اس نے ایک طلائی رومال باندھ رکھا ہے۔ وہ آرام سے بیٹھی درمیانہ دیوداروں کے چھتنار کے سایہ میں اس گھاٹی کا اسکیچ بنا رہی ہے جہاں درختوں کی پھُنگوں کا ایک جال سا بنا ہُوا ہے، اور جس کے آخر میں ندی کے پانی کی ایک لکیر کھِنچ گئی ہے۔

"یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اپنی راہ دیکھو"

میں نے اطمینان سے کہا "یہاں سبزہ زیادہ گاڑھا ہے۔ پھولوں کے تختے اور دیوداروں کے جال کا تناسب صحیح نہیں، خصوصاً یہاں تو"

"بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ٹھیک کرتی ہوں ۔ ۔ ۔ کیا تمہیں واٹر کلر کا شوق ہے؟"

"مجھے واٹر کلر سے عشق ہے۔ یوں سمجھئے کہ ابھی عشق ہُوا ہے"

لیرا مسکرائی، اور پون گھنٹہ خاموش بیٹھی، اسکیچ بناتی رہی۔

"مجھے بھوک لگی ہے، اور میرے پاس صرف یہ چند بسکٹ ہیں" لیرا نے ایک بسکٹ لبوں کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن" میں نے کہا۔ "میرے پاس یہ بھنا ہُوا مُرغ ہے۔ اس تھرماس میں۔ اور چند چپاتیاں بھی ہیں۔ اگر تمہیں ہندوستانی کھانے سے نفرت نہ ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو ـــــ"

وہ شوق سے کھانے لگی۔ پھر بولی "اس میں CHILLIE بہت زیادہ ہیں۔ نہ جانے تم لوگ مرچیں اس قدر کیوں پسند کرتے ہو؟"

"یہ کھانے کا ذائقہ دوچند کر دیتی ہیں، ہندوستانیوں کی جہاں اور ہر ایک حس مر چکی ہے وہاں ذائقہ کی حس ابھی برقرار ہے، بلکہ متواتر فاقوں سے یہ حس اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ اِس لیے سُرخ مرچیں۔"

"نہ جانے تم لوگوں میں یہ کیا عادت ہے" اس نے اپنے پلاٹینمی بالوں کو جھٹکا کر کہا۔ "کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات کرو۔ وہ ہر پھیر کر سیاست پہ آجاتے گا۔ میں سُرخ مرچوں کا ذکر کر رہی تھی

تم اپنے وطن کی سیاست کا ذکر لے بیٹھے۔ نہ جانے کیا بات ہے!"

اس کے سُرخ لب غصّہ سے خمیدہ ہو گئے تھے۔

میں نے کہا، "چلو، سُرخ مرچوں کے ذکر کو جانے دو، آؤ سُرخ لبوں کا ذکر کریں۔ ان گلاب کے پھولوں کا جو تمہارے رخساروں پہ کھلے ہُوئے ہیں اُن چاند کی کرنوں کا جن سے تمہارے بال بنے ہیں۔ اُن سپنوں کا جو تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں کانپ رہے ہیں، جیسے کسی خاموش جھرنے کی سطح پہ ترناری کے حیراں و لرزاں پھول"!

دوسرے دن شام کو گل مرگ کے بازار میں لیرا اد کا نر گھوڑے پر

سوار چلی جارہی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اُس نے مجھے لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب! ...

جو سڑک گل مرگ کی وادی کے بیچوں بیچ جاتی ہے وہ گاف کورس کو درمیان میں قطع کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف انگریز مرد اور عورتیں گاف کھیلتے نظر آتے ہیں اور کشمیری ہاتھوں میں گاف کے جھولے اور چھڑیاں اُٹھائے ان کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اس سڑک پر گل مرگ کا کلب ہے۔ اور آگے چل کر عین وسط میں ایک اونچی جگہ پر امپیریل بینک اور بینڈونز ہوٹل جاگیردارانہ نظام میں اور اس سے پہلے جو اہمیت دھرم شالہ اور معبد خانہ کو تھی، اس مہاجنی نظام میں وہی اہمیت ہوٹل اور بنک کو حاصل ہے، نئے نظام کے نئے مظہر، پجاری البتہ وہی ہیں۔

اس سڑک پر انگریز اور انگریز نما ہندوستانی گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں کشمیری نوکر سُرخ شلغم اور پیاز کے گٹھے اُٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں —— انڈوں کی ٹوکریاں، مٹن، مٹر اور پھل اُٹھائے سے جا رہے ہیں، لیکن یہ چیزیں ان کے کھانے کے لیے نہیں ہیں۔ صاحب لوگوں کے بچوں نے ہیٹ پہن رکھے ہیں اور قیمتی اُونی سوئٹر۔ میم صاحب لوگوں نے کارڈ مخمل کی بیش قیمت پتلونیں پہن رکھی ہیں، جنہیں گل مرگ کے کشمیری درزیوں نے سیا ہے۔ لیکن یہ لوگ ان پتلونوں کو کبھی نہیں پہن سکتے۔ یہ لوگ صرف مزدوری کر سکتے ہیں، جیسا کہ پنچایت کا فرمان ہے ”مزدوری میں عزت ہے“ اسی سڑک پر ایک ہانتو بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جوتے مرمت کرنے والا ہے، اور ایک گداگر۔ ہانتو پیلی پیلی

پکی ہُوئی ناشپاتیوں کی ایک ٹوکری سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ یہ ناشپاتیاں وہ اپنے کھیت کی مینڈھ پر اُگے ہُوئے ناشپاتی کے درخت سے اُتار کر لایا ہے۔ اس کھیت میں جو اناج تھا اسے زمیندار، بنئے اور حکومت نے رہن رکھ لیا ہے۔ اب دو تین۔ ناشپاتیوں اور سیبوں کے درخت باقی رہ گئے ہیں وہ ان کا پھل گل مرگ لے جا کر بیچتا ہے۔ تاکہ وہ صاحب لوگوں کو ناشپاتی اور سیب کھلا کر اپنے بیوی بچّوں کے لیے کچھ تھوڑے سے چاول خرید سکے۔ مگر اگر آلتی پالتی مارے بیٹھا تو پیسہ مانگ رہا ہے جوتا مرمّت کرنے والا ایک ایسا جوتا مرمّت کر رہا ہے۔ جس کی قیمت پچاس روپے سے کم نہ ہوگی، خود اس کے پاؤں ننگے ہیں تلووں میں بیایاں پھوٹ آئی ہیں، اور ایک جگہ سے تو خون بھی بہہ رہا ہے۔ لیکن جوتوں کی تو خیر قیمت بھی ہوتی ہے بھلا اس خون کی کیا قیمت ہوگی۔

ایک بوڑھی انگریز عورت اپنی رنگین چھتری گھما گھما کر اپنے ساتھ چلنے والی عورت سے کہہ رہی ہے۔ "مائی ڈیئر تمہیں معلوم نہیں کہ جب وہ ہندوستانی ہمارے کمرے میں گھس آیا تو مجھے کتنا ڈر معلوم ہُوا۔ ڈر اور غصّہ میں بھاگ کر دوسرے کمپارٹمنٹ میں اپنے خاوند کے پاس چلی گئی۔ ۔ ۔"

آج بہت دنوں کے بعد میں پھر اس سرکلر روڈ پر سیر کرنے کے لیے نکلا ہُوں یہ جنگل بالکل خاموش ہے۔ کشمیر کی وادی پر سُورج غروب ہو رہا ہے، اور بڑھتے ہُوئے اندھیرے اور گھٹتی ہُوئی روشنی کی ایک مسلسل شطرنج سی بنتی جا رہی ہے۔ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ اس وادی کی قسمت کیوں خاموش ہے۔ یہ جنگل اپنے بیٹوں کے لیے بھی نہیں بولتا۔ اس جنگل کا شہد

اس کے اخروٹ، اس کے سیب، انڈے، لکڑی، اس کا ریشم، اس کی ساری خوبصورتی و رعنائی اس کی کوئی چیز بھی اپنے بیٹوں کے لیے نہیں، یہ کیسی خدائی ہے؟ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا "مزدوری نہ کرو" کارڈ مخمل کی پتلونیں پہنو۔ سیب کھاؤ۔ خوبانی اور اخروٹ کھاؤ۔ مزدوری کرنے سے انکار کر دو۔ گھوڑے کی سواری کرو۔ دندناتے پھرو یہ زمین تمہاری ہے یہ آسمان تمہارا ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں تو آؤ اس ساری وادی کو ایک جھیل بنا دیں۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی جھیل جس میں... ٹنگ مرگ اور گل مرگ سب سما جائیں، جس کے پانیوں میں انسانی بے رحمی کے جہنمی اور وحشی گھروندے سب فنا ہو جائیں۔ بس چاروں طرف وہی پرانی جھیل ہو، ہزاروں لاکھوں سالوں کی جھیل اور اس کے چاروں طرف وہی برف کے گلیشر اور برف سے لدے ہوئے پہاڑ کھڑے ہوں۔ تاکہ جب آسمان کی پہنائیوں سے سورج کی پہلی کرن جھیل کی سطح پر اترے تو مسرت سے چلا اٹھے۔ "شکر ہے ابھی انسان پیدا نہیں ہوا۔"

حادثے

اُن یادوں میں سے جو دل میں اُتر جاتی ہیں اور مٹانے سے نہیں مٹتیں۔ بلکہ ہر بار تازہ ہو جاتی ہیں، اور دل کے گھاؤ کو اور بھی گہرا کر دیتی ہیں، ایک یاد میرے چھوٹے بھائی کا قتل ہے، ہزار کوشش کرنے پر بھی میں اس واقعے کو نہیں بھولا ہوں، یوں ہی بیٹھے بٹھائے، دوستوں سے خوش فعلیاں کرتے ہوئے زندگی کے حسین اور مسرت بھرے لمحوں کے درمیان یکایک میرے سامنے میرے چھوٹے بھائی کا چہرہ آجاتا ہے اور اُس کی بڑی بڑی آنکھیں، آنسوؤں سے بھری ہوئی، ٹرمٹر تکتی ہوئی، چپ چاپ مجھے دیر تک گھورتی رہتی ہیں، اور میری مسرت ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ قہقہوں کے فوارے سُوکھ جاتے ہیں، اور ہونٹوں کی مسکراہٹ اس طرح مُرجھا جاتی ہے جس طرح تپتے ہوئے سورج کی تیز دھوپ میں چنبیلی کا پھول، وہ میرا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اُس کا نام راجہ تھا۔ شکل و صورت سے بھی وہ کسی پرستان کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے

اتنا قبول صورت لڑکا بہت کم دیکھا ہے، شاید اسی لیے گھر کے سب بہن بھائی اُس سے نفرت کرتے تھے، آخر یہ اس قدر خوبصورت کیوں ہے، اور قدرت نے اس قدر صاف رنگ، اتنی اچھی آنکھیں، اس قدر متناسب اعضا کیوں بخشے ؟ اسی لیے ہم سب بھائی بہن اُس سے ہمیشہ لڑائی جھگڑا مول لینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ گو میں اس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میں بی۔ اے میں، لیکن اُس کی خوب صورتی نے میرے اندر اس قدر احساس کمتری پیدا کر دیا تھا کہ میں ہر وقت سوچتا رہتا کہ جب یہ لونڈا میری عمر کو پہنچے گا تو یہ کتنا حسین جوان ہوگا، شکیل، طرح دار، خوبصورت اور جب یہ کالج جائے گا تو جہاں ہم لوگ بالکل بدھو اور گھسیارے سمجھے جاتے تھے اُس میدان میں اس کمبخت کی فتوحات بھلا سکندرِ اعظم سے کیا کم ہوں گی۔ یہی سوچ سوچ کر میرا جی اندر ہی اندر گھٹنے لگتا اور میں اپنی ساری جلن اور نفرت اُس سے لڑنے جھگڑنے اور موقع بے موقع اُس سے مار پیٹ کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔ راجہ بے حد ذہین، شریر، ضدی اور بد پرہیز تھا، اور ماں باپ کا سب سے لاڈلا اور چہیتا بیٹا تھا۔ میرے والد تو خصوصاً اُس سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ہمیشہ صبح و شام اُس کے ساتھ اکٹھے کھانا کھاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر ہم لوگوں کو کس قدر ناگوار گزرتا ہوگا۔ انہی شرارتوں کی وجہ سے وہ اکثر پٹتا، اور اپنی بد پرہیز طبیعت کی وجہ سے اکثر بیمار رہتا، چند ایک جنسی بیماریوں کو چھوڑ کر دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی بیماری ہوگی جو اُسے لاحق نہ ہوئی ہو، اور اُس کا علاج کرتے کراتے گھر کے سب لوگ

تقریباً خود ڈاکٹر بن چکے تھے، معمولی ملیریا سے نمونیا اور ٹائیفائڈ تک ہر مرض کے نسخے زبانی یاد ہو گئے تھے لیکن ان تمام بیماریوں کے باوجود راجہ کے جسم میں مدافعت کی اتنی شدید قوت تھی کہ وہ ہر بیماری پر قابو پا لیتا، اور پھر وُہی اُس کا خوبصورت، مسکراتا ہُوا چہرہ ہمیں چڑانے کے لیے گھر میں، گھر سے باہر، ہر جگہ موجود ہوتا، کہتا، دیکھو، تم کس قدر بدشکل ہو، بھونڈے، گنوار معلوم ہوتے ہو، اور میری طرف دیکھو میں ہوں راجہ، پریوں کا شہزادہ!

.... اور اس قتل کی ابتدا ایک لڑکی کے مُسکرانے سے ہُوئی۔

سبھیا کیوں مسکرائی (اِس لڑکی کا نام سبھیا تھا) اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے، شاید اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ سبھیا کیوں مُسکرائی میں پُوچھتا ہُوں، میرے والد کی تبدیلی اس دُور افتادہ مقام پر کیوں ہُوئی جہاں سبھیا رہتی تھی، سبھیا کیوں مسکرائی، سبھیا اس قدر خوبصورت کیوں تھی۔ اُس مقام پر دو ندیاں کیوں بہتی تھیں۔ وہاں دیودار کے جنگلوں سے بھرے ہُوئے پہاڑ کیوں تھے۔.. وہاں کی آب و ہوا مرطوب کیوں تھی۔ وہاں چاول اس قدر افراط سے کیوں پیدا ہوتے تھے۔ وہاں کے لوگ خوش حال کیوں تھے۔ لڑکیاں جب پانی بھرنے گھڑے سروں پر اُٹھائے ہُوئے گاتی ہُوئی ایک قطار میں چلتی تھیں۔ اِس کا جواب کس کے پاس ہے؟ واقعات کے اس تسلسل کو سمجھنے کے لیے جس فلسفے کی ضرورت ہے وہ میں ابھی تک تخلیق نہیں کر سکتا۔ نہ ہی وہ مجھے کہیں سے ابھی تک دستیاب ہو سکا ہے۔

اگر زندگی حوادث کے تسلسل کا نام ہے تو بے شک سبھیا کے مسکرانے کو

ایک حادثہ سمجھنا چاہیئے۔

سجیا کو سب سے پہلے میں نے اپنے مکان کے باغ کی باڑھ پر کھڑے دیکھا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ شفق غائب ہو چکی تھی، اور وہ باڑھ کے کنارے باغ کے دروازے پر جو ناتراشیدہ لکڑیوں کا بنا ہُوا تھا۔ ایک کالی شلوار اور نیلی قمیص اور ملگجے دوپٹے میں کھڑی تھی۔ میں نے ٹہلتے ٹہلتے اُسے دیکھا۔

تم کون ہو

وہ جواب میں مُسکرائی۔

وہ پُر اسرار شرمائی ہُوئی سی مُسکراہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ اتنی ہی واضح اور روشن ہے۔ جتنا میرے بھائی کے قتل کا واقعہ، حیرت ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی حادثے کی کڑیاں کیسے ہو سکتی ہیں؟ جب وہ مُسکرائی تو مجھے اتنا تو ضرور معلوم ہُوا کہ کوئی بہت بڑا حادثہ ضرور ہُوا ہے۔ لیکن یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس حادثے سے میرے سوا اور کسی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

سجیا کے اس عجیب تبسّم کے بعد اور بہت سی باتیں ہُوئیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں سے بُہت دُور ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ وہ گاؤں یہاں سے دو دن کے فاصلے پر ہے۔ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ کوئی دس پندرہ دن وہ اپنے عاشق کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتی رہی، جنگلوں میں چھپی رہی، پہلے پہل بُہت لطف آیا تھا۔ ہر چیز رومانی اور پُر کیف معلوم ہوتی تھی۔ ایک دفعہ جب وہ بھوکے رہے تو اس میں ایک خاص لذّت تھی۔ اُس وقتی پیاس میں بھی ایک انوکھا مزہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ نشہ

اُترتا گیا، وہ دونوں اس چھپنے اور بھاگتے رہنے کی زندگی سے اُکتا گئے اور جب دوچار

مسلسل فاقے برداشت کرنے پڑے۔ تو رومان اور عشق اور جذبات کی بلاخیزیاں اڑن چھو ہوگئیں، دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہوگئے، نگاہیں چرانے لگے، دونوں نے دل ہی دل میں ایک دوسرے کو صلواتیں سنانا شروع کیں، بعد میں کھلم کھلا ایک دوسرے کو طعنے دینے لگے، مرد نے عورت کو پیٹا اور سمیا پھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب وہ واپس اپنے گھر لوٹ جانا چاہتی ہے وہ تین دن سے بھوکی ہے۔ اُس نے یہ باغ دیکھا، اور یہ پکے ہوئے پھل۔ اس نے سوچا کہ وہ کیوں اب بھوکی رہے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ آج رات اسی باغ میں رہے گی اور مزے سے پھل کھائے گی اور جب صبح ہوگی تو یہاں سے چپ چاپ چلی جائے گی۔

اِس کے بعد وُہ مسکرائی۔

میں نے کہا سمیا اب تم واپس اپنے گھر کیسے جا سکو گی۔ عین ممکن ہے کہ گاؤں والے تمہاری ناک کاٹ دیں اور تم زندگی بھر نکٹی رہ کر اک بھکارن کی طرح در بدر گھومتی رہو۔

اب وہ مسکراہٹ آنسوؤں میں تبدیل ہوگئی۔ یہ اک اور بہت بڑا حادثہ تھا۔ سمیا کہنے لگی۔

تو اب میں کیا کروں؟

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ میں نے

وہ ترکیب اُسے بتادی۔ پہلے تو اُس نے سر ہلا کر انکار کیا، بعد میں رضامند ہو گئی۔ بے حد اچھی ترکیب تھی وہ۔ اس میں اسی کا بھلا تھا کہ بُرا صرف یہ ہُوا کہ جیب میں اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ تو راجہ نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرے شریفانہ اطوار اور نیک چال چلن سے بخوبی واقف تھا اور اس لیے مری حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ بس یہی بہت بُرا ہُوا۔ اور گو سجیا نے وہ رات باغ میں بسر کرنے کے بجائے باغ کے مالی کے گھر بسر کی۔ لیکن پھر بھی راجہ کو مجھ پر رشک رہا اور اُس نے صاف کہہ دیا کہ اگر میں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو وہ جھٹ گھر کے لوگوں کو مطلع کر دے گا۔ راجہ بے حد شریر تھا میری زندگی کے حسین ترین چراغوں کو پھونک مار کر ہمیشہ کے لیے بجھا دینے کا سنہری کام اسی کے ہاتوں سے پُورا ہُوا ہے۔

میرے کہنے سے مالی نے سجیا کو اپنے گھر جگہ دی، اور یہاں وہ مالی کی بھانجی بن کر رہنے لگی، اور ہمارے گھر کا اور باغ کا کام کرنے لگی، صرف راجہ اصل راز سے آگاہ تھا اور اس کا منہ بند کرنے کے لیے مجھے بہت سے وسیلے اختیار کرنے پڑتے۔ جس کی وجہ سے میں اس کی طرف سے اور بھی پریشان ہو گیا، اور میری نفرت اور بھی بڑھ گئی، پہلے تو میں شاید اُس سے جلتا تھا۔ لیکن اب تو یہ مکمل۔ شدید۔ سچی نفرت تھی۔ اس قدر لڑاکا۔ لالچی، جھوٹا، چغلخور، لڑکا تھا وہ۔ مجھے اس طرح پریشان کرتا تھا کہ توبہ ہی بھلی، کھانا کھاتے ہُوئے نہایت معصوم بن کر وہ کوئی ایسی ویسی بات کر دیتا کہ میری سٹی بٹی گم ہو جاتی، اور میں دل میں یہ سمجھتا کہ اس کمبخت نے اب راز افشا کیا کہ اب کیا۔ ۔ ۔

چند روز اسی حالت میں گزرے، اور اس دوران میں سمیا اور میں عشق و محبت کے اُن منازل کو طے کرنے لگے، جن کا تعلق چاندنی راتوں، اور ندی کے نرمل پانی۔ اور بلبل کے چہچہوں اور چشمے کے کنارے کانپتی ہوئی پھولوں کی ڈالیوں سے ہے۔ ساری فضا میں شاعری رچ گئی تھی، اور میں تو جب محبت میں گرفتار ہوتا ہوں۔ تو بُری طرح ہوتا ہوں۔ شعر کہتا ہوں۔ روتا ہوں قے کرتا ہوں، زکام ہو جاتا ہے۔ بھوک مر جاتی ہے۔ عجیب مصیبت ہے یہ عشق۔ لیکن شکر کا مقام ہے کہ اس بیماری کی میعاد چھ ماہ سے زیادہ نہیں۔ کم از کم مجھے تو چھ مہینے کے عرصے ہی میں نجات مل جاتی ہے۔!

لیکن یہاں تو ابھی یہ حادثہ شروع ہُوا تھا، اور میرا یہ حال تھا کہ بس یہ آخری حادثہ ہے۔ بحرِ محبت کا آخری ساحل ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ میں سمیا سے شادی کر لوں گا۔ اب کسی اور سے محبت نہ کروں گا۔ زندگی امن و چین سے بسر ہوگی۔ میں حقہ پیوں گا، اور ایک درجن بچوں سے گھوڑا گاڑی کا دلچسپ کھیل کھیلا کروں گا۔ لیکن اب سنیئے کیا ہُوا۔ پہلا حادثہ تو یہ ہُوا تھا کہ سمیا مسکرائی تھی۔ اب یہ ہُوا کہ ندی سے میرا مطلب ہے کہ جہاں ہم رہتے تھے۔ وہاں کی وادی میں بہنے والی ندیوں نے طغیانی پر آنے کی ٹھان لی۔ متواتر تین دن وہ ابرو باراں رہا کہ ساری وادی میں جل تھل ہو گیا۔ بہت سے گاؤں بہہ گئے۔ ان میں سمیا کے باپ کا گاؤں بھی تھا۔ مگر خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل حادثہ تو یہ تھا کہ ندیوں میں طغیانی آئی۔ بہت سے ڈھور ڈنگر بہہ گئے۔ دیہات تباہ ہوتے۔ لوگ مرے اور سمیا کے ماں باپ بھی مر گئے۔ اب

سمیا کا میرے سوا کون تھا۔ اور گو وہ ابھی تک مالی کے گھر میں رہتی تھی لیکن میں نے یہ دل میں ٹھان لی تھی کہ اب کے گرمی کی چھٹیاں ختم کر کے جب واپس کالج جاؤں گا۔ تو چپکے سے سمیا کو بھی اپنے ساتھ لیتا چلوں گا۔ پھر میں اُسے ایک گھر لے دوں گا، اور میں تھوڑے روز کالج جایا کروں گا، اور جب میں کالج سے لوٹ کر گھر آیا کروں گا تو وہ دروازے پر میرا انتظار کرتے ہوئے اس طرح کھڑی ہو گی۔ جس طرح ہندوستانی فلموں میں ہیروئن ہیرو کا انتظار کرتی ہے۔ آہا۔ بس مزے ہی مزے ہوں گے، اور میں دل ہی دل میں گنگنانے لگا "اک بنگلہ بنے نیارا"۔

بعد میں میں نے یہی بات سمیا سے کہہ دی اور اُسے اک بنگلہ بنے نیارا والا گیت بھی سنایا۔ وہ یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوئی۔ میں اُس کی خوشی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کی خوشی دیکھ کر بے حد خوش ہوتے، اتفاق سے راجہ نے بھی کہیں ہماری یہ باتیں سن لیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی اس خوش خبری کو سن کر کس قدر خوش ہوا ہو گا۔

اِس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اُسے میں حادثہ نہیں کہتا۔ قتل بھی نہیں کہتا۔ اپنی بدقسمتی کہتا ہوں۔ ہوا یہ کہ طغیانی دُور ہونے پر جب کہ ندیوں کا پانی ابھی تک گدلا گدلا تھا اور مرے ہوئے جانوروں اور ڈھور ڈنگروں کی بدبو اُس میں آتی تھی۔ شیطان راجہ نے اُن پانیوں میں نہانے کی ٹھانی۔ وہ بہت دیر تک اس گندے پانی میں نہاتا رہا۔ تیرتا رہا۔ اور پانی کی کلیاں کرتا رہا۔ غالباً بہت سا پانی اپنی خرمستیوں کے دوران میں اُس کے پیٹ میں چلا گیا۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ اُسی

شام کو اسے بخار ہو گیا اور سارے بدن پر سوجن ہو گئی
پھر یہ سوجن بڑھتی گئی۔
اور بڑھی، حتیٰ کہ اُس کا سارا جسم پھُول کر کُپّا ہو گیا۔ خوبصورت آنکھیں سوجے ہوئے پپوٹوں میں چھُپ گئیں، رسِ بھرے لب پھٹے ہوئے انجیر نظر آنے لگے، ہاتھ پاؤں نیلے، کالے، پیلے، جو سب سے شکیل تھا، وہ سب سے بدصورت ہو گیا۔ اس سے ہم سب بھائی بہنوں کو تسکین ہوئی ایک گو نہ ریں بظاہر اُس کی بیماری پر کُڑھتا تھا۔ لیکن خوش بھی تھا۔ کیونکہ اب کوئی نگہداشت کرنے والا نہ تھا اور چاندنی راتیں تھیں، اور راجہ بستر سے اُٹھ نہ سکتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس بیماری کے دوران میں وہ میرا راز کبھی افشا نہ کرے گا۔ وہ بے حد ذہین تھا اور مجھ پر اپنا شکنجہ ہمیشہ کے لیے مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ راز افشا کر کے اُسے کیا مِل جاتا۔

ڈاکٹر نے اُس کا علاج کیا۔ لیکن وہ اچھا نہ ہُوا۔ سُوجن بڑھتی گئی، ایک اور ڈاکٹر کو شہر سے بُلایا۔ سُوجن کم ہونے لگی۔ کم ہوتے ہوتے تقریبًا تقریبًا ناپید ہو گئی۔ ماں باپ بے حد خوش ہُوئے، ہم بھی تھوڑے سے خوش ہُوئے، پھر دوسرے دن وہ بیمار پڑ گیا اور پھر سُوجن بڑھنے لگی۔

اس طرح پانچ بار سُوجن کم ہُوئی اور بڑھی۔ ڈاکٹر نے بڑی تندہی سے علاج کیا۔ لیکن یہ سُوجن ہمیشہ گھٹتی بڑھتی تھی، اور کسی طرح دُور نہ ہوتی تھی۔ اس لمبی بیماری کے دوران میں اُس کا پھُول کا سا حُسن مر گیا۔ ہونٹوں پر سیاہی رخساروں پر جھائیاں اور رس بھری آنکھوں میں اُداسی آ گئی۔ راجہ وہ راجہ نہ

رہا تھا۔ اب وہ پرستان کا شہزادہ نہ رہا تھا، بلکہ کسی بھوت پریوں کی بستی کا لڑکا۔ اس کی بدصورتی سے بہت لوگوں کے دلوں کو تسکین سی ہُوئی، لیکن ساتھ ہی ساتھ تشویش بھی بڑھتی گئی۔ وہ اچھا تو ہو جائے، یہ سوچ کیوں نہیں گھٹتی؟

ڈاکٹر نے کہا، یہ جگہ بہت مرطوب ہے اور اب موسم بھی خنک ہے اور راجہ کو اوڈیما ہو گیا ہے۔ دل بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ اگر اس کا علاج کسی خشک جگہ پر ہو سکتا، جہاں دھوپ بہت ہو، اور سنگترے بافراط ملیں تو یہ لڑکا بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔

ماں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ جب میرا بڑا بیٹا پڑھنے کے لیے جائے گا تو اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ وہاں اس کا اچھی طرح سے علاج ہو گا، کھُلی دھوپ ہو گی اور میرے لال کو سنگترے بھی کھانے کو ملیں گے۔ یہ کمبخت تو ایسی بُری جگہ ہے کہ یہاں بھی ناشپاتیوں اور کیلوں کے سوا کچھ ملتا ہی نہیں۔

میں نے دل میں سوچا۔ میں راجہ کو ساتھ کیسے لے جا سکتا ہوں، میں تو بیمبا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہُوں۔ اگر راجہ بھی میرے ساتھ ہُوا تو سب راز افشا ہو جائے گا اور یہ تو بہت بُری بات ہو گی۔

والد صاحب بولے۔ میں اپنے بیٹے کو کہیں نہ بھیجوں گا۔ میرا پیارا راجہ یہیں اچھا ہو جائے گا۔ کیوں ڈاکٹر صاحب ؟!

ڈاکٹر نے کہا۔ اُمید تو ہے لیکن اگر ۔ ۔ ۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب اس کا دل کمزور ہے۔ سفر میں اگر خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو۔ ۔ ۔ ۔

والد صاحب بولے۔ ہاں۔ ہاں۔ یہ تو سوچیے۔
ڈاکٹر نے جواب دیا RISK تو ضرور ہے۔ مگر۔
مگر کیا؟ میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں یہ ذمّہ داری اپنے سر نہیں لیتا۔ ہاں البتہ سنگترے میں وہاں سے پارسل کر دوں گا۔
راجہ چپ چاپ ہماری سب باتیں سنتا رہا۔ اس کا سوجا ہُوا چہرہ بُدھ کی طرح تھا۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔
میرے والد نے اُس کا گال تھپتھپاتے ہُوئے اس سے پُوچھا، کیوں بیٹے۔۔۔ بڑے بھائی کے ساتھ جائے گا۔ لیکن راجہ نے کچھ نہ کہا، وہ خاموش بیٹھا رہا۔
کئی دن بیت گئے۔ میری رخصت کے دن ختم ہو گئے۔ اب میں گھر والوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ راجہ بدستور بیمار تھا۔ وہ اچھا نہ ہُوا تھا۔ لیکن اُس کی حالت بُری بھی نہ تھی۔ دل میں ایک بار خیال آیا اُسے ساتھ لے چلوں۔
لیکن پھر فوراً ہی سمجیا کا خیال دل پر غالب آگیا۔ بیہودہ کہیں کا۔ راجہ اور سمجیا دونوں کو ایک ہی مکان میں تو کیسے رکھ سکے گا۔ بے وقوف، جاہل؟
بس اب ہنسی خوشی سب سے رخصت ہو لے۔
رخصت ہوتے وقت میں نے اپنا ہاتھ راجا کے سر پہ رکھا۔ وہ بستر پہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اُس نے مجھے نمستے کہا۔
میں نے کہا۔ راجہ بھیّا تم اچھے ہو جاؤ گے۔
ماں رو رہی تھیں۔

والد صاحب بولے۔ ہاں۔ ہاں! راجہ بیٹا تم اچھے ہو جاؤ گے۔ لو اب مُسکرا دو۔ تمہارا بڑا بھائی کالج جا رہا ہے۔ مُسکرا کر اُسے الوداع کہو

راجہ نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ نگاہ اب تک میرے سینے میں محفوظ ہے۔ برمے کی نوک کی طرح اندر کھٹکی ہُوئی ہے۔ میں اُسے ہر بار باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن کامیاب نہیں ہُوا۔ اُمید نہیں کبھی کامیاب ہو سکوں۔ یہ کہانی بھی اس کوشش کا نتیجہ ہے۔

لیکن راجہ والد صاحب کے کہنے پر بھی مُسکرایا نہیں۔ چُپ چاپ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہی اور پھر کروٹ بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔

اور پھر اِس واقعہ کے پندرہ روز بعد مجھے وہ خواب میں ملا۔ میں نے دیکھا اُس کی ساری سُوجن دُور ہو گئی ہے اور اب وہ پہلے کی طرح بھلا چنگا ہے قبول صورت ہے۔ شریر ہے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے۔ اُس نے اپنی باہوں پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے مجھے طنزاً کہا۔ بڑے بھیّا دیکھو۔ اب میں اچھا ہو گیا ہوں۔

میں نے کہا راجہ میں بہت خوش ہوں۔ بے حد مسرور ہوں۔

اس کے بعد میری آنکھ کُھل گئی اور میں نے یہ خواب سب کو سُنایا۔

دوسرے دن تار مِلا۔ راجہ اسی رات کو مر گیا تھا۔ دل کی حرکت بند ہو جانے سے۔

- -

میرا خیال ہے کہ میں راجہ کی موت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ وہ اگر میرے

ساتھ آ بھی جاتا تو نہ بچ سکتا۔ اُس کی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ اُس کا بچنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ اس لیے یہ اچھا ہُوا کہ وہ اپنے باپ کی گود میں مر گیا۔ اپنی شفیق ماں کی آنکھوں کے سامنے اِس دنیائے فانی سے رخصت ہُوا۔ مجھے اس کی موت کا قلق ہے، وہ میرا بھائی تھا۔ میں کئی بار اُس کی یاد میں رو رہا ہوں۔ لیکن میں یقین رکھتا ہُوں کہ میں قطعاً اُس کی موت کا ذمّہ دار نہیں۔

- -

لیکن کبھی کبھی اُس کی موٹی سُوجی آنکھیں مجھے رات کے اندھیرے میں گھورنے لگتی ہیں۔ ان آنکھوں میں نہ وہ محبّت ہے، نہ نفرت وہ مجھے کچھ نہیں کہتیں۔ ان کے لہجے میں کوئی شکوہ نہیں شکایت نہیں۔ بس وہ مجھے صرف تکا کرتی ہیں۔ اور میں اکثر گھبرا جاتا ہُوں۔ اور اُن نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ سوچتا ہوں۔ میں ہی اس کا قاتل ہوں۔ میں نے ہی اُسے اُس گندی مرطوب، خنک جگہ میں مرنے سڑنے دیا۔ جب میں اُس سے رُخصت ہو رہا تھا۔۔ اور جب وہ چپ چاپ بُدھ بنا اپنے بستر پر لیٹا تھا تو اُس کے جسم کا رواں رواں، سُورج کی دُھوپ، سنہری چمکدار دھوپ، اور خنک آب و ہوا اور سنگترے کے رس کے لیے بے تاب ہو رہا تھا اور اس کا جسم ان چیزوں کو حاصل نہ کر سکا اور فاقے کرتے کرتے مر گیا۔ ایڑیاں رگڑتے رگڑتے اُس کے نحیف جسم نے جان دی۔ کیونکہ بمبیا مسکرائی تھی۔ اور بمبیا میرے ساتھ تھی۔

- -

اور آج جب کہ بھیا بھی میرے ساتھ نہیں ہے ذلیل قحبہ خانے کی نذر ہو چکی ہے
اور میں اک کامیاب خوش حال تاجر ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ میں قاتل نہیں
ہوں۔ میں قاتل ہوں۔ میں نہیں نہیں میں قاتل نہیں ہوں۔ ہاں اتنا ضرور
چاہتا ہوں کہ کائنات کی کوئی قوت اُس وقت کو پھر واپس لا دے۔ جبکہ
راجہ بدھ بنا ہوا بستر پہ بیٹھا تھا، اور میں اُسے الوداع کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔
اے کائنات کے ظالم کمینے، اندھے صدر اعظم۔۔۔۔ اُن لمحات کو پھر
واپس بُلا دے، صرف ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار ؛

غلاظت

لاریوں میں بھی سماجی زندگی کی طرح تین درجے ہوتے ہیں: "فرسٹ" "سیکنڈ" اور "پبلک" یعنی اُمرا، شرفا اور عامی۔ یُوں تو ہماری سماجی زندگی کی طرح لاری بھی ساری کی ساری گندی ہوتی ہے، غلاظت سے معمور، گرد و غبار اور پیٹرول کی خطرناک بُو سے بھرپور، لیکن اس گندی اور غلیظ دنیا میں بھی لوگ تین چوبی تختے آر پار ڈال کر اُس میں جماعتی امتیاز پیدا کر لیتے ہیں اور چند ٹکے زیادہ دے کر ایک ذلیل سے احساس برتری کے زیرِ سایہ اپنے دل کو تسکین بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی یہی کیا۔ اور کشمیر جانے والی لاری کے دوسرے درجے میں اپنے لیے جگہ مخصوص کرالی۔ میں دراصل کھڑکی کے سامنے بیٹھنا چاہتا تھا۔ تاکہ لاری کی غلیظ دنیا میں رہتے ہُوئے بھی باہر کی خوشگوار فضا کے مزے لے سکوں۔ اس فریبِ نفس کو پُورا کرنے کے لیے میں نے ایک اور فریب سے کام لیا۔ کیونکہ کھڑکی والی جگہ

ایک سانولے رنگ کے کرسچین پولیس سارجنٹ کے لیے ریزرو ہو چکی تھی، اور مجھے کھڑکی کے قریب ضرور بیٹھنا تھا۔ چنانچہ میں نے پان والے کی دکان سے دو پیسے کی الائچی اور دو لیموں خرید کر جیب میں ڈال لیے، اور خود دوسرے درجے میں آکر اُسی کھڑکی والی جگہ پر بُرا سا منہ بنا کر بیٹھ گیا۔ حسنِ اتفاق سے ابھی لاری کے چلنے میں چند منٹ باقی تھے اور سانولے رنگ کا لمبا تڑنگا کرسچین پولیس سارجنٹ لاری سے نیچے اُتر کر کچھ فاصلے پر اپنے کسی دوست سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس لیے وہ میری طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ ہاں جب لاری چلنے لگی، تو اُس نے بکمالِ شرافت مجھے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں نے جواب میں بکمالِ متانت اُسے الائچی کی پُڑیا اور دو لیموں دکھا دیئے، اور گویا اُسے اچھی طرح بتا دیا۔ کہ اگر وہ مجھے کھڑکی میں بیٹھنے نہ دے گا۔ تو میرے بار بار قے کرنے سے خود اُس کا جی بھی بُرا ہو گا، اور عین ممکن ہے کہ اُس کے کپڑے بھی قے کی آلائش سے نہ بچ سکیں۔ میرے جواب سے کرسچین سارجنٹ پُورا مطمئن تو نہ ہُوا، لیکن بے بس ضرور ہو گیا اور میں یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ اس زندگی میں طمانیت کسے نصیب ہے؟ بے بسی چاہیئے۔ کیونکہ پھر آدمی اپنی ساری تکلیفوں کے لیے کسی شقی القلب اور ظالم خدا کو ذمّے وار ٹھہرا سکتا ہے۔ جس نے لاری میں قے کرنے والے آدمی بنائے تھے۔ کرسچین پولیس سارجنٹ کی یہ بے بسی چند لمحوں تک محدود رہی۔ کیونکہ اس کے بعد باتوں باتوں میں ہمیں پتہ چلا کہ ہم دونوں ایک زمانہ

گزرا ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد وہ پہلی مغائرت جاتی رہی اور ہم جلد ہی اس لاری کی گندگی میں اس طرح گھل مل گئے جس طرح مکھیاں غلاظت کے ڈھیر میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

اِس طرف اطمینان حاصل کر کے میں نے لاری کے اندر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ فرسٹ سیٹ پر یعنی اُمراء کے درجے میں ایک صاحب بہادر بیٹھے ہوئے پائپ پی رہے تھے۔ ایلفرڈ یا کیا نام تھا اور پائیلٹ تھے اور اب چوبیس دن کی چھٹی لے کر کشمیر جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے دوسرے درجے کی اگلی نشستوں پر لاری کے مالک کے خاندان کی دُہری ٹھوڑی والی دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ اُن کے ساتھ چار پانچ سال کی عمر والے دو لڑکے تھے۔ دوسرے درجے کی پچھلی نشستوں پر میرے اور کریمین پولیس سارجنٹ کے علاوہ ایک سردار صاحب بیٹھے تھے اور اُن کی بیوی ۔ ۔ ۔ اور اُن کی چھوٹی لڑکی بھی۔ اور ہمارے پیچھے یعنی عامیوں کے درجے میں "پبلک" بیٹھی تھی۔ اس میں دو کسان، ایک بہرہ، دہری ٹھوڑی والی عورتوں کی نوکرانی، ایک کلینر، ایک دکاندار جسے سیالکوٹ جانا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت، گُڑ کی بوریاں، مکھیاں، مسافروں کے اٹاچی کیس، تھرماس، سوٹیاں، چھتریاں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے سوچا یہ لاری ہماری سماجی زندگی کی نمائندگی بالکل صحیح تناسب سے کرتی ہے۔ سب سے پیچھے کسان، کسان کے آگے بابو لوگ۔ اُن کے بعد سرمایہ دار، سرمایہ دار کے اُوپر انگریز۔ انہی بنیادوں پر ہندوستان کے

موجودہ سماج کے اہرام بلند ہوئے تھے۔ لیکن ان اہرام کے نیچے کس کی قبر موجود تھی۔ شاید ہماری اُسی زندگی کی، جسے ہم کبھی دوبارہ نہ زندہ کرسکیں گے، ان ممیوں میں اب کون رُوح پھونک سکتا ہے۔

جنگ کی وجہ سے پٹرول کمیاب ہے، اس لیے لاری پٹرول اور اسپرٹ کی آمیزش سے چلائی جاتی ہے۔ لاری کو لاہور سے چھ بجے روانہ ہونا تھا۔ لیکن چھ بجے تک تو لاری کے مالک کے خاندان کی عورتیں بستر سے نہ اُٹھی تھیں۔ اس لیے لاری نو بجے روانہ ہوئی۔ انگریز ہوا باز فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اور میں اور کریمین پولیس سارجنٹ اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو بُرا بھلا کہتے رہے کہ جس کی وجہ سے لاری تین گھنٹے دیر سے چلی۔ اُن دہری ٹھوڑی والی عورتوں نے بہت سے سونے کے زیور پہن رکھے تھے۔ ان کی جلد کی رنگت زیتونی تھی، اور

اسی طرح ملائم (کیونکہ میں اُنہیں چھُو کر تو دیکھ نہ سکا تھا) بڑی عورت کے پپوٹے غلافی تھے، رُخساروں پر سیب کی سی سُرخی آنکھوں میں خمار اور پلکوں کے گنجان سائے پر کاجل کی لکیر کا دھوکا ہوتا تھا۔ اس کے بازوؤں کا گداز پن کبھی کبھی کریمین سارجنٹ کو اس قدر متوجہ کرلیتا تھا، کہ اس کی آنکھوں میں ایک گرسنہ چمک پیدا ہو جاتی اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ کھُل کر باہر لٹکنے لگتے۔ دوسری عورت شلوار کو ٹخنوں کے اُوپر کیے ڈرائیور کی سیٹ سے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں تو اچھی نہ تھیں۔ ہاں دانت بہت اچھے تھے۔ وہ بار بار ہنستی تھی۔ یا ہر وقت مسکراتی رہتی

تھی۔ پہلے پہل تو وہ مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ یہ مسکراہٹ دوامی تھی۔ کسی انگریزی صابون کے اشتہار کی طرح آپ نے اکثر اُس عورت کو دیکھا ہو گا۔ جو بڑے بڑے شہروں کی دیواروں پر چسپاں ہمیشہ مُسکراتی نظر آتی ہے، اور جس کے نیچے لکھا ہوتا ہے "ہمیشہ لکس صابون استعمال کیجیئے"۔ ایسی عورت ہمیشہ دُور سے اچھی لگتی ہے، اور تھوڑا عرصہ گذر جانے پر اس کی مسکراہٹ دل پر گراں گزرنے لگتی ہے۔ ایسی عورت کو آپ دُور سے دیکھ سکتے ہیں اس سے محبت نہیں کرسکتے۔ بھلا کوئی آدمی ایک ایسے اشتہار سے کیسے محبت کرسکتا ہے، جو ہمیشہ مسکراتا ہُوا نظر آئے۔ میں نے دل ہی دل میں اُس عورت کے خاوند کو سراہا۔ جو ہر روز نہایت صبر و استقلال سے اس عورت کی مسکراہٹ کو برداشت کرتا تھا۔ یقیناً ایسے مرد کا مرتبہ غازی اور قومی شہید سے بھی بلند وارفع ہے۔

ان دہری ٹھوڑی والی عورتوں کے ساتھ جو دو چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ انہیں بھی اس بات کا احساس تھا کہ یہ لاری اُن کی ہے۔ یہ ڈرائیور یہ کلینر اُن کے ہیں، وہ جب چاہیں لاری ٹھہرا سکتے ہیں۔ ڈرائیور اور کلینر کو جب چاہیں کان سے پکڑ کر باہر نکال سکتے ہیں۔ لاری کے مسافروں کو بیجا تنگ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمیں بار بار پریشان کرتے تھے اور بڑی عورت سُرخ رخساروں والی، اپنے کان میں پڑے ہُوئے طلائی آویزوں کو ہلا کر کہتی معاف کرنا۔ یہ لڑکا بڑا شریر ہے۔ بے نا۔ دراصل یہ

لالہ جی کا پوتا ہے۔ سب سے بڑا پوتا اور اس لیے سارے خاندان میں اس کا حکم چلتا ہے۔ شاید اس عورت نے ہمیں بھی اپنے خاندان کے غریب افراد متصوّر کر لیا تھا۔ اور دُوسری عورت بے وجہ مسکرا کر کہتی۔ ہائے ببب جی (بھابی جان کا مخفف) میرا جی چاہتا ہے کہ کشمیر پہنچ کر کرم کا ساگ کھاؤں۔ اے رام سنگھ، جب ہم کُد پہنچیں تو مجھے یاد دلانا میں کُد سے کرم کا ساگ خریدوں گی۔ ہائے ببب جی۔ کرم کا ساگ! اور پھر وہ اپنے لبوں سے ایک ہوائی چٹکی لے کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے ننگے ٹخنوں پر رکھ لیتی۔ اس طرح کہ میرا جی بے اختیار چاہتا کہ اُس کی موٹی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اِس طرح مروڑوں کہ نہ ببب جی رہیں۔ نہ یہ کرم کا ساگ۔ بڑی عورت کہتی، ساوتری۔ تجھے معلوم ہے لالہ جی نے کشمیر کی ساری سڑک کا ٹھیکہ لے لیا ہے' تین لاکھ روپے کا نفع ہوگا۔۔۔ یہ کہتے کہتے اُس کی دُہری ٹھوڑی پر اور شکن پڑ گئے اور اس نے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا اور پھر تیکھے، اپنی نوکرانی کو آواز دے کر کہنے لگی، ذرا ننھے کے لیے دودھ اور گلوکوس ڈی بوتل میں رکھنا، اور دیکھنا چوسنی بالکل صاف ہو تب مجھے معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنی رانوں کے درمیان دوپٹے کے نیچے لالہ جی کے ایک اور پوتے کو بھی دبا رکھا ہے۔ ایک اور ننھے سے سانپ کو۔ یہ بڑا پیارا خوبصورت بچہ تھا۔ جیسے سبھی ننھے سانپ ہوتے ہیں، اور جب اُس غلافی پپوٹوں والی عورت نے اُس ننھے سے بچے کو میری طرف بڑھا کر کہا، ذرا اسے ہماری نوکرانی کو دے دیجیے۔ تب مجھے پُورا یقین

ہو گیا کہ میں واقعی لالہ جی کے خاندان کا کوئی غریب فرد تھا نہ کہ لاری میں بیٹھا ہُوا ایک آزاد مسافر، جس نے اپنی جگہ دوسرے درجے میں روپے دے کر حاصل کی تھی۔

یہ سڑک جس پر لاری جا رہی تھی۔ لاہور سے گوجرانوالہ اور گوجرانوالہ سے سیالکوٹ اور سیالکوٹ سے جموّں کی طرف جاتی تھی۔ گوجرانوالہ پہنچ کر یہ لاری چند لمحوں کے لیے رُکی۔ اور اس میں پبلک کے درجے میں دو پولیس کے سپاہی داخل ہُوئے۔ اُن کے ساتھ ایک کھدر پوش ملزم بھی تھا۔ غالباً کوئی سیاسی قیدی یا اسی قسم کا آوارہ مزاج سر پھرا۔ میں نے لاری سے اُتر کر تھوڑے سے آم خریدے اور ایک چاقو کہ جس کا پھل بہت تیز تھا، اور جس کے دستے پر سیپ لگا تھا۔ کریمین سارجنٹ نے تھرماس کھول کر برفیلا پانی پیا، اور صاحب بہادر نے بیرے کو آواز دی کہ وہ انہیں بازار سے بسکٹوں کا ایک ڈبّہ خرید کر لا دے۔ بیرے نے اپنے طرّے کو اور بھی بلند کیا اور اپنی قمیص کے سخت کالروں کو جن کے اندر کوئی ٹائی موجود نہ تھی، سہلاتا ہُوا بازار کی طرف چل دیا۔

بس والوں کے ایجنٹ نے آکر مالکنوں کو سلام کیا۔ "کھانا کھا لیجیے۔"

ڈرائیور بولا "بی بی جی شربت منگواؤں؟" حلوائی بولا "تازہ پکوڑیاں ہیں۔"

ایک خوانچہ فروش کچا ناریل لگائے آگے بڑھ آیا۔ ہمیشہ مسکرانے والی عورت بولی "ہائے غضب جی، میرا جی چاہتا ہے کہ کچا ناریل کھاؤں۔ ایک دفعہ جب میں جموّں میں گئی تو مجھے وہاں کچا ناریل کھانے کو نہ ملا۔ پڑا ہائے

بھیب جی۔ میراجی بار بار چاہتا ہے کہ کہیں سے کچا ناریل مل جائے اور اُسے میں کھا جاؤں۔ "اس ناریل کا کیا بھاؤ ہے؟" "چار آنے پاؤ۔" رام رام۔ ٹو تو لوٹتا ہے۔ "دو آنے سیر دے گا۔" "نہیں بی بی جی۔" "اچھا دو آنے کا دے دے۔" ایک بوڑھا کاغذ کی ننھی ننھی چڑیاں بیچ رہا تھا۔ جو ربڑ کی ڈوریوں کے سہارے بار بار پھدکتی تھیں۔ ننھے لڑکوں کو یہ چڑیاں بہت پسند آئیں۔ انہوں نے بوڑھے سے تین چار لے کر اپنے پاس رکھ لیں اور انہیں ہلا ہلا کر ہوا میں لہرانے لگے۔ بھیب جی کی نند کچا ناریل کھا رہی تھی اور اُس کے ہونٹوں سے کرکر کی کراہت آمیز آواز پیدا ہو رہی تھی، اور میراجی چاہا کہ اس عورت کو کچے ناریل کی طرح چبا جاؤں، تاکہ یہ کرکر کی آواز تو نہ پیدا ہو۔ لیکن ... پھر خیال آیا کہ مُوسیٰ بے وطن ہو جائے گا .... اتنے میں لاری چلنے لگی، بوڑھا چلّانے لگا۔ "میرے تین پیسے۔ ان لڑکوں نے تین چڑیاں"! ..... لیکن لاری بہت آگے جا چکی تھی۔

کھدر پوش قیدی بکواس کرنے لگا۔ یہ اسی طرح غریبوں کو لوٹتے ہیں ایک پیسہ، ایک ایک پیسہ کر کے، اُن کے خون کے قطرے جمع کرتے ہیں اور پھر اسی خون کو اپنی بیویوں کے زرد رخساروں میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو ہمارے کسانوں کی بیویاں پچیس برس کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہیں اور یہ لالہ جی کے خاندان کی عورتیں چالیس برس گزر جانے پر بھی اسی طرح سیب کی طرح سُرخ رہتی ہیں۔

ڈرائیور نے گاڑی ٹھہرالی۔ اور بولا۔ اے پولیس کے سپاہیو! اپنے

اس ملزم کے حواس درست کرو۔ ورنہ میں گاڑی سے نیچے اُتار دوں گا۔

بھب جی بولیں۔ نہایت متین انداز میں۔ "سیالکوٹ آ لینے دو، وہاں لالہ جی کے پھوپھا کیپٹن جیا رام بھچندہ رہتے ہیں۔۔۔۔ مزاج خود بخود درست ہو جائے گا۔" پھر وہ ساوتری سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

"یہ پھوپھا پہلے صرف جمعدار تھے۔ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پاتے تھے، یا شاید اس سے بھی کم اور اب کیپٹن، پر بڑا کمینہ ہے یہ بھی۔ ایک دفعہ لالہ جی کو کچھ روپے کی ضرورت پڑی۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن آخر ہمارا رشتہ دار ہے۔ میرا خیال ہے ساوتری کہ جب لاری سیالکوٹ میں سے گذرے تو ہم ذرا ایک آدھ گھنٹے کے لیے اُن کے ہاں سے ہو آئیں۔"

کھدر پوش قیدی بولا۔ میں یہ گاڑی کہیں ٹھہرنے نہ دوں گا۔ یہ کیا مذاق ہے۔

ایک پولیس کے سپاہی نے اُسے ایک زبردست ٹھوکا دیا۔ اپنی بکواس بند کرو۔ تم کون ہو۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔"

رام سنگھ ڈرائیور نے لاری کی رفتار تیز کر دی۔ گاڑی تیزی سے سیالکوٹ کی طرف بھاگی جا رہی تھی، نیم کی چھدری چھدری چھاؤں میں کہیں کہیں کالی بھینسیں جگالی کرتی ہوئی نظر آ جاتیں، ان کی نگاہوں میں ایک ایسا سکون تھا کہ جو لاری کے کسی مسافر کو نصیب نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر بھینس کا بھی ہوتا ہے۔ کالا، کیچڑ میں لت پت، جگالی آمیز لیکن اس نقطۂ نظر میں کس قدر تیقن ہے، کتنا سکون، مجھے شاید کشمیر جا کر

بھی یہ آرام نہ مل سکے۔ یہ انگریز بار بار اپنی نشست پر بیٹھا ہوا بے چین ہوا جاتا تھا۔ سردار کی زرد رُو بیوی نقاہت کی ماری ہوئی اپنے خاوند کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس طرح پینترے بدل رہی تھی،

اور اس طرح منہ بنا رہی تھی جیسے اُسے اسقاطِ حمل ہوا ہو۔ انگریز کا بیرہ ریاست پونچھ کی بولی میں اپنے صاحب کی بہادری کی داستانیں بیان کر رہا تھا، اور نوکرانی خالص ڈوگرے انداز میں اُس پر حاشیہ آرائی کر رہی تھی، لیکن کھدّر پوش قیدی سے لے کر رام سنگھ ڈرائیور تک لاری کا ہر فرد بے چین اور رکمینہ نظر آتا تھا، زیرِ نظر منظر میں اگر کوئی چیز پاک صاف، مقدس اور پُرسکون تھی، تو یہی بھینس جو کسی نیم کی چھاؤں میں جگالی کرتے نظر آجاتی۔ میں نے سوچا کہ آدمی آدمی کے بجائے بھینس ہوتا اور اسی طرح کسی نیم یا جامن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر جگالی کرتا، تو زندگی کس قدر آرام اور سکون سے بسر ہوتی۔ لیکن اب آدمی آدمی نہ تھا، ایک بھینس بھی نہ تھا، بلکہ ایک بیرہ ایک صاحب بہادر ایک قیدی، ایک سارجنٹ، نتیجہ یہ کہ زندگی کی لاری بھاگی جا رہی ہے اور ہم سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بے چین اور غیر مطمئن ہیں۔

یکایک گایوں کے ایک وسیع ریوڑ نے لاری کو روک لیا، اور رام سنگھ نے لاری سے اُتر کر گوالے کو دو چار طمانچے جڑ دیئے حرام زادہ۔ مین سڑک کے بیچ میں گایوں کو لیئے لیئے پھرتا ہے، جیسے یہ ڈپٹی کمشنر کا بچہ ہے سالا، بدمعاش، گوالا حیران نگاہوں سے رام سنگھ کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ اُس نے لاری کو آتے دیکھا تھا اور اُسی وقت سے وہ گایوں کے

ریوڑ کو ایک طرف کرنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ اب اگر چند گائیں اُس کے منع کرنے پر بھی اِدھر اُدھر بکھر جائیں تو اُس میں اُس کا کیا قصور تھا۔ گوالے کی نگاہوں میں یہ سب کچھ تھا۔ التجا۔ انصاف کی التجا۔ اور اپنی بے بسی، اور بے چارگی۔ کیونکہ انسانی سماج میں ڈرائیور کا مرتبہ ایک گوالے سے اونچا ہے اور جو اونچا ہے وہ اپنے سے کم مرتبہ رکھنے والے کو مار پیٹ سکتا ہے گالیاں دے سکتا ہے۔ گوالے کی آنکھوں کی مجروح معصومیت اسی تلخ حقیقت کی آئینہ دار تھی۔

کھدر پوش قیدی رام سنگھ کو صلواتیں سنانے لگا۔ تم خود ایک مزدور ہو۔ اور ایک غریب کسان پر ظلم کرتے ہو۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ ایک حاکم اُف۔ یہ کس قدر جاہل ملک ہے۔ خدا کرے اس سارے ملک پر بجلی گر جائے۔ دشمن کے بم اسے تباہ و برباد کر دیں۔ اس کا ایک ایک گھر، گھر کی ایک ایک اینٹ، تباہ و مسمار ہو جائے۔ کچھ نہ رہے اس ملک کا۔ یہ گاندھی کا ملک ہے؟ یہ ہندوستان ہے یا پاکستان ہے؟ میرے خیال میں تو یہاں سب اُلو بستے ہیں۔ قبروں کے اُلو۔

کھدر پوش کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا، اور دونوں سپاہی اسے دو تڑ کوٹنے لگے، یہ اِسی طرح گاؤں گاؤں بکواس کرتا ہے اور بغاوت پھیلاتا ہے۔ حرام زادہ"!

کھدر پوش چلّا چلّا کر کہنے لگا۔ ہاں ہاں، میں بغاوت پھیلاتا ہوں، مجھے مار ڈالو۔ مجھے جان سے مار ڈالو۔ میں سچی بات کہتا ہوں۔ اور سچی

بات کبھی کسی کو بُری معلوم نہ ہونی چاہیئے۔ ٹھیک ہے نا۔ اور مارو میرے جسم کے قتلے کر ڈالو۔ لیکن وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ میری آواز خاموش نہیں رہ سکتی وہ ہندوستان کے کونے کونے میں گونجے گی۔

میں اور کرسچین پولیس سارجنٹ ہنسنے لگے۔

کھدر پوش ہماری طرف شعلہ بار نگاہوں سے تاکتا ہُوا بولا، کمینو، مجھ پر ہنستے ہو۔ میں اب تک دس بار جیل میں جا چکا ہوں، میری بیوی تپ دق سے مر گئی ہے، میرا لڑکا تعلیم سے محروم رہ کر جیب کترا بن گیا ہے۔ میری زمین قرق ہو کر نیلام ہو چکی ہے۔ مجھ پر ہنستے ہو، ظالمو، میں اب تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم کبھی سرمایہ دار بن کر میرے سامنے آتے ہو۔ کبھی بابو بن کر، کبھی بنیا بن کر، کبھی پولیس سارجنٹ بن کر، کبھی لیڈر بن کر۔ لیکن تم وہی۔ میں اب تمہیں۔ اچھی طرح پہچان گیا ہُوں۔ خُون چوُسنے والے چمگادڑ۔۔۔۔۔۔"

پولیس کے سپاہی نے اُس کے منہ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ رام سنگھ نے گاڑی کھڑی کر دی، سیالکوٹ شہر کی کچہری سامنے تھی۔ اور ملزم اور سپاہیوں کو یہیں اُترنا تھا۔ سپاہی ملزم کو اتارنے لگے۔

نوکرانی بولی۔ کوئی پاگل ہے پاگل۔

انگریز ہَوا باز تیوری چڑھا کر اپنا پائپ سُلگانے لگا۔

ساوتری بولی۔ ہائے صاحب جی۔ آپ کو یاد ہے اس کچہری کی عمارت ہمارے بابوجی نے بنوائی تھی!

سپاہی ملزم کو لیے کچہری کے اندر چلے گئے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک بڑا سا کھمبا لگا تھا۔ جس پہ جلی حروف میں لکھا تھا، "کشمیر" کو عفونت اور غلاظت سے بھری ہوئی یہ لاری کشمیر کو جانے والی سڑک پہ مڑ گئی۔

مقدّس

وہ بے حد شریف، باقونی، اور معصوم تھا، وہ اُن معدودے چند خوش قسمت آدمیوں میں سے، جنہیں اپنی بیوی سے والہانہ محبّت ہوتی ہے جو پرائی عورت کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ لیتے ہیں، لیکن کوئی بُرا ارادہ دِل میں نہیں رکھتے، بعض ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ یہ ناممکن ہے، جھک مارتے ہیں سالے۔۔۔۔۔

اُس کی خوش قسمتی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بیوی شادی کے دوسرے ماہ حاملہ ہوگئی، اور جب فرزندِ ارجمند یعنی وہ ہر وقت رونے بسورنے والا ننھّا سا لونڈا معرضِ وجود میں آیا، تو اس کی تبدیلی کسی دوسرے شہر میں ہوگئی۔ یہ شہر اس کے وطن سے پانچ سو میل کے فاصلے پر تھا۔ ناچار اُسے اپنی بیوی اور بچّے کو چھوڑ کر جانا پڑا، اس امر کا اُسے بہت قلق تھا اور اکثر احباب کی محفل میں چوتھے پیگ کے بعد وہ اپنی حد سے زیادہ حسین بیوی اور خوبصورت بچّے

کا ذکر کر کے رو یا کرتا ۔

یہ شہر نیا تھا۔ یعنی اُس کے لیے نیا تھا۔ نوکری بھی نئی تھی، یعنی اُس کے لیے نئی تھی، تنخواہ کم تھی۔ یعنی — ہاں — بس سب کے لیے کم تھی ہر وقت برخواست کیے جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بیوی کو بُلانا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ چند مہینوں کے بعد — البتہ — وہ ہر چند مہینوں کے بعد اسی طرح سوچتا، اس دوران میں اس کی محبّت گہری ہوتی گئی، اُس کی شیفتگی، وارفتگی بڑھتی گئی۔

آہ، میں تمہیں کیسے بتاؤں، مجھے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے، میری بیوی تو ایک دیوی ہے، اس قدر پاکیزہ، مقدس، معصوم، حسین، جیسے کنول کا پھول ۔۔۔۔۔ اس شہر میں تو اُس جیسی ایک عورت بھی موجود نہیں۔

وہ ہر روز اپنی بیوی کو ایک خط لکھتا۔ ہر روز اس کی بیوی اُسے ایک خط بھیجتی، ہر روز ڈاک خانوں میں اُن کے ارمان کا چرچا ہوتا۔

یوں بڑا خوش مذاق تھا، حسین اور طرحدار عورتوں کی خوبصورتی اور اُس کی جزئیات کو ایک ماہر جوہری کی طرح پرکھ سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں مدوّر ہیں۔ گاؤدم ہیں، شفاف ہیں، گداز ہیں ۔۔۔ اُس کی سپیدی میں نئے ریشم کا نکھار ہے، ناک خنجر آبدار ہے ۔۔۔ اُس کی صباحت میں پکے ہوئے سیب کی دمک ہے، اُس کی اُٹھان میں غرور ہے، حیا بھی ہے۔ شوخی بھی ہے۔ کمر کولہوں سے ۴۵ ڈگری کا زاویہ بناتی ہے، جیومیٹری کے اعتبار سے یہ دنیا بھر میں سب سے متناسب کمر ہے، لیکن

بیوی ..... !

ایک سال گذر گیا۔

جنگ شروع ہو گئی۔

چیزیں گراں ہونے لگیں، اُس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ ضرور ہُوا تھا۔ لیکن قیمتوں میں اس سے دُگنا بلکہ اکثر حالتوں میں چوگنا اضافہ ہُوا تھا، اس کے اپنے شہر میں چیزیں ابھی اس قدر گراں نہ ہُوئی تھیں، اور پھر اپنا تھا۔ کرایہ ادا نہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس نئے شہر میں تو..... یہاں وہ اپنے ایک دوست کے ہاں اقامت پذیر تھا۔ مصلحت، جنگ، فراق — !

اس نے اپنی بیوی کو چار سو بار لکھا۔ مجھے تم سے بے انداز محبت ہے۔

اُس کی بیوی نے اُسے چار سو اور ایک بار لکھا۔ پیارے ہم دونوں چاند اور چکور کی طرح ہیں۔

اُس نے اپنی بیوی کا خط پڑھ کر سوچا۔ یہ ٹھیک ہے، چاند اور چکور، کبھی چاند ہوتا ہے، تو چکور نہیں ہوتا، چکور ہو تو چاند نہیں ہوتا..... دونوں ہوں تو کچھ اور مصیبت آجاتی ہے، بادل آجاتے ہیں، بارش ہونے لگتی ہے جنگ شروع ہو جاتی ہے، تبادلہ ہو جاتا ہے۔

اُس نے اپنی بیوی کو لکھا۔ اپنی نئی تصویر بھیجو۔

تصویر آئی، احباب نے کنول کے پھول کو دیکھا اور گلیکسو بسکٹ یعنی بچے کو بھی، دوست حاسد بن گئے، جل کٹی سنانے لگے۔ وہ بہت خوش ہُوا۔

ہر روز رات کو سونے سے پیشتر وہ اُن دونوں تصویروں کو سرہانے

سے نکال کر دیکھتا۔ کلیجے سے لگاتا، پھر اُنہیں چومتا، پھر بجلی کی بتی گل کر کے سو جاتا اور تخیل میں دیر تک اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہتا، آہ میری جان، مجھے تم سے ابدی محبت ہے، لازوال، کبھی نہ مرنے والی۔

دو سال گزر گئے، لیکن چھٹی نہ ملی۔

زندگی بھیکی ہوتی گئی۔ یادیں دھندلی ہوتی گئیں۔

سرِ شام وہ اپنے احباب کے ساتھ مال اسٹریٹ میں چکر لگاتا۔

ارے دیکھنا یار۔۔۔۔ وہ پتلی چھریری سی لڑکی، واللہ، کیا کمان کا سا تناؤ ہے۔۔۔۔۔ ارے وہ غالب کا شعر ہے نا!۔۔۔۔

چند روز سے ایک پارسن بدھو کے پُل پر سے گزرتی ہوئی مال اسٹریٹ میں داخل ہوتی تھی اور جنوبی چوک تک خراماں خراماں چلتی ہوئی پھر پُل کی طرف لوٹ آتی تھی۔۔۔۔ وہ غزالیں آنکھیں، جیسے آنسوؤں سے دھوئی گئی ہوں۔۔۔۔۔ وہ شبنمی تبسم۔۔۔۔ کمر کا وہ زہریلا لوچ

چند روز وہ اُسے دیکھتا رہا، اور اُس کے مقدس پاکیزہ، معصوم تخیل میں بلبلے پھوٹنے لگے۔

کبھی تو وہ دہانی ساری میں ملبوس ہوتی، کبھی گہرے نیلے سائے میں کبھی نیم عریاں گاؤن میں۔۔۔۔۔۔ ہر بار اس کے سنورے ہوئے بالوں کا ایک خاص انداز ہوتا۔۔۔۔ اور وہ شبنمی تبسم۔۔۔۔۔۔

وہ گھورتے ہوئے ٹکٹکی لگائے، اُس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ جیسے بے پٹرول موٹر۔ رسّی سے بندھی ہوئی، کسی تیز رفتار لاری کے پیچھے پیچھے

بھاگتی جاتی ہے۔

پانچ روز کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہ آئی

جب احباب نے پوچھا تو کہنے لگا، میری بیوی سے اُس کی شکل ملتی تھی، تم نے غور نہیں کیا؟ ------ آہ، مجھے اپنی بیوی سے بے انداز محبت ہے۔۔۔۔۔ دراصل بہت کم ایسی عورتیں ہیں، جنہیں میرا مذاقِ سلیم ۔۔۔۔۔ کمبخت اپنا معیارِ حسن اب اتنا بلند ہو گیا ہے کہ اب اوسط درجے کی حسین عورت بڑی مشکل سے جچتی ہے۔

احباب اُس وقت مال اسٹریٹ میں سے گزر رہے تھے۔

ایک نے پوچھا۔ اُس لڑکی کے متعلق، تمہارا کیا خیال ہے۔

بازو اچھے ہیں، لیکن چال میں توانائی نہیں۔

اور وہ ۔۔۔۔۔۔ جامنی ساڑے والی؟

گداز ہے، لیکن ذرا بھاری ۔۔۔۔۔۔۔ ذرا عمر زیادہ ۔۔۔ ۔

ذرا ۔۔۔۔ آہ، میری بیوی!

احباب ہنسنے لگے۔

ایک سال اور گزر گیا۔

اب وہ اکثر اکیلا گھوما کرتا۔ کیونکہ اُس کا معیارِ حسن بہت بلند ہو گیا تھا اور بہت سے احباب مطلق تخیل پسند نہ تھے۔

اُن کی زندگی تجرباتی تھی، وہ غلطیوں کے قائل تھے۔ ان کا فلسفہ بودا بلکہ ناپید تھا۔ انہیں اپنی بیویوں سے مطلق محبت نہ تھی، کیونکہ وہ

شب و روز اُن کے ساتھ جونک کی طرح لپٹی ہوتی تھیں، ان کے لیے ہر عورت جو اُن کی بیوی نہ تھی۔۔۔۔ حسین تھی۔

اب وہ اکیلا رہ گیا تھا، مال سٹریٹ میں لُوسی کی ٹانگیں اُسے خطرناک حد تک پسند آنے لگیں، اور اس کے دماغ کے دھندلکوں میں بار بار ناچنے لگیں۔ اُس کا جی چاہا وہ انہیں صرف ایک بار یوں چھو کر دیکھ لے ۔۔۔۔ لارا کی ٹھوڑی کا خم اُسے بہت بھلا معلوم ہونے لگا اور کیٹ کا اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گھما گھما کر پُر غرور انداز میں سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنا ۔۔۔۔ اور جمشید جی لانڈری والے پارسی کی نوجوان بیوی کو لہوں کو کیسے چکی کے پاٹوں کی طرح گھما گھما کر چلتی تھی، بھئی عجیب نشہ ہے اُس میں، کیسی ڈھلی ڈھلائی لونڈیا ہے!

اور پھر سینما میں اُس نے امریکن سپاہی کے ساتھ جس شوخ کو دیکھا تھا صرف چہرہ ہی اچھا تھا، لیکن ایمان سے کیا چہرہ تھا! اور پُورے چہرے سے بھی نصف چہرہ ۔۔۔۔ ہئے ہئے ۔۔۔۔ وہ دانت کٹکٹانے لگتا۔ رُخ پر غازے کا ہلکا ہلکا سا غبار ۔۔۔۔ جیسے تازہ سیب کی نرم روئیں ۔۔۔

جی ہاں اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی، اُسے لُوسی سے محبت تھی، اُسے لارا سے محبت تھی، اُسے کیٹ سے محبت تھی، اُسے لانڈری والے کی بیوی سے محبت تھی، اُسے امریکن سپاہی کی محبوبہ سے محبت تھی ۔۔۔۔ اور یہ محبت کتنی سچی، پاک، مقدس بے لوث محبت تھی۔

جب کبھی اُسے اپنی پاکیزہ محبت کا خیال آتا، اُس کے گلے میں ہچکیاں

تڑپنے لگیں، اور آنکھوں میں آنسو، آہ، اس کے دل میں کس قدر محبت تھی۔
ایک سال اور گزر گیا۔

کرسمس کی رات تھی، مان اسٹریٹ کی چھوکریاں دکانوں کی طرح سجی ہوئی تھیں، بجلی کی پاکیزہ روشنی معصوم چہرہ پر متحرک رہی تھی۔ چکاچکا بوم چک، چکاچکا بوم چک!۔۔۔۔۔۔

کرسمس کی رات تھی اور وہ چار سال سے ایک کنوارے کی طرح معصوم تھا کیونکہ اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔

دوستوں نے کہا۔ آج کرسمس کی رات ہے، کل پھر نیا سال ہے، آؤ تم بھی زندگی کی آگ میں کود جاؤ!

وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے۔۔۔۔ اور پھر ہر شخص کا اپنا معیار ہوتا ہے۔!

وہ نکڑ پہ اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

سڑکیں، گلیاں، کوچے، بازار، کسی پرانے ملکے اسٹیشن کی لائٹوں کی طرح حدِ نگاہ میں بے ترتیب بکھرے پڑے تھے، وہ چلتا گیا اور اس کے دماغ کے دھندلکے میں ناچ گھر کا شور اور خوشبوئیں اور ٹانگیں اور سرسراتی ہوئی ساریاں اور ٹھوڑیوں کے خم اور لبوں کے تبسم گھومتے گئے، اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتا گیا، آخر اسے معلوم ہوا کہ اُس کا گھر آگیا ہے، وہ رک گیا، پھر ٹھٹھک گیا، گھر کی اندھیری دہلیز پہ ایک عورت کھڑی تھی۔

اُس کی بیوی مُسکرائی
وہ مُسکرائی۔

- -

ایک عرصے کے بعد جب اُسے ذرا ہوش آیا تو اُسے محسوس ہُوا کہ یہ اُس کا گھر نہیں ہے، اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی اور موٹے ہونٹوں والی عورت کو اپنی آغوش میں لیے شراب پی رہا ہے، اور اُس سے بار بار کہہ رہا ہے، میری جان، پیاری، مجھے تم سے بے انداز محبت ہے... مجھے تم سے بے انداز محبت ہے۔ پاکیزہ ...... سچی ... مقدس ..... بے لوث .....!

رنڈی نے پھیکے بے جان لہجے میں کہا۔ ہاں! میں چاند ..... تم چکور ... ذرا یہ ریڈیو کھول لو!

پہلی اڑان

جب سرکار نے عبداللہ کو شاگرہ میں پرائمری اسکول کھولنے کے لیے بھیجا تھا تو سب سے پہلے جس لڑکے نے اسکول میں داخل ہونے پر رضامندی ظاہر کی، وہ گلاب تھا گاؤں کا یتیم اپنے چچا ست نرائن کی ریشہ دوانیوں کا شکار، وہ بہت جلد عبداللہ اور اُس کی بیوی بتول سے مانوس ہو گیا، اور خاص کر جب بتول نے اُس سے شرارت آمیز لہجہ میں کہا، اور تم گلاب تم میرے نام پر ہنستے ہو، اپنے نام کے متعلق کیا خیال ہے، تمہارا نام تو ایسا ہے جیسے کسی مسلمان کا ہو.... گلاب ... گلاب؛ بھلا گلاب بھی کسی برہمن کا نام ہو سکتا ہے"، گلاب یہ سُن کر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

پہلے پہل عبداللہ کو پرائمری اسکول کے لیے لڑکے اکٹھے کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ چند دنوں تک وہ بچارا اکیلا سکول میں بیٹھا رہا۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں پہاڑوں پر ڈنگر ڈھور لے جاتے، روزمرّہ کا راستہ چھوڑ کر اسکول کی راہ لیتے۔ اور حیرت اور شوخی اور شرارت کے ملے جلے جذبات سے ماسٹر عبداللہ کی طرف دیکھتے۔ جو اُن کے ماں باپ کی طرح فرغل اور اُونی چولا بھی نہیں پہنے ہُوئے تھا۔ اس کے سر کے بال بھی بھیڑ کے اُون کی طرح نہیں کٹے ہُوئے تھے۔ وہ کھدّر کی ایک شلوار اور قمیص پہنے تھا اور قمیص کے اُوپر اُس نے ایک کوٹ پہن رکھا تھا، جو فرغل کے نصف سے بھی کم تھا، اور جس پر نہایت دلفریب چوکور دھاریاں بنی ہُوئی تھیں، ہا۔ ہا۔ ہا اور اس کی لمبی سی ناک... ہا۔ ہا۔ ہا...

"ارے یہ ناک ہے یا گھسی ہُوئی پُولہ[1] ؟"

"ارے یہ مچھلی مار کی چونچ ہے !"

"نہیں یہ بوڑھے دادا کی ٹیک والی چھڑی ہے۔ دیکھو نا۔ بالکل اسی طرح ہے!"

"بالکل بجوکا معلوم ہوتا ہے"

"چلو بھاگو، میاں، نہیں تو پٹو گے۔"

"دھا۔ دھا۔ نیلی۔ تو مر جائے۔ ادھر مت جا۔ ادھر ماسٹر جی بیٹھے ہیں۔ ہش ہا۔ سوہنی۔ کمبخت کدھر جاتی ہے۔ یہ سکول ہے" اور اس طرح ہنستے اور مذاق کرتے ہُوئے چرواہے اور چرواہیاں ریوڑوں کو ہنکاتے جنگل کو ہُوئے چلے جاتے۔ عبداللہ کڑھتا۔ مسکراتا۔ چیں بجبیں ہوتا لیکن

---

[1] پُولہ کشمیری دھان کی بنی ہُوئی چپل کو کہتے ہیں جسے گاؤں کے غریب کسان اور مزدور لوگ پہنتے ہیں۔

کیا کرتا۔ ابھی پچھلے سال اس لیے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اب بیوی بھی تھی۔ جب تک وہ میٹرک میں پڑھتا رہا، اس کے سسر نے بکمال مہربانی بتول کو اپنے گھر پناہ دی تھی لیکن اب اس کی بے فکری کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اسکول میں سب سے ذہین لڑکا تھا۔ لیکن آگے پڑھائی جاری رکھنے کے لیے صرف ذہانت کام نہیں دے سکتی تھی۔ کالج کی پڑھائی کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ بے حد کفایت کے بعد بھی اس غریب کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کالج میں پڑھ سکے ہار مان کر اس نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت قبول کر لی تھی اور قبول کرنے کا کیا سوال تھا۔ اُسے یہ ملازمت بھی بہت دشواریوں کے بعد ملی تھی۔ دس روپے تنخواہ تھی اور دو فرد تھے، ایک عبداللہ دوسرے بتول۔ کئی بار عبداللہ کو خیال آیا کہ اگر وہ ان پڑھ کسان کا ان پڑھ بیٹا ہی رہتا تو شاید اس کی زندگی بہتر ہوتی۔ لیکن تعلیم نے اُسے اب زندگی کی اُس منزل پر پہنچا دیا تھا، جہاں سے وہ پیچھے نہ ہٹنا چاہتا تھا۔ یہ خودکشی ہوتی۔ بتول اُسے بہت پیاری تھی، ایسی محبت اُسے اپنے ماں باپ سے بھی نہ ہوئی تھی، لیکن دس روپے میں وہ اُسے شال دوشالے نہ اڑھا سکتا تھا، وہ کھدر کے کپڑے جو وہ خود پہنتا تھا۔ اُسی کھدر سے بتول کی قمیصیں اور شلواریں بنتی تھیں بتول کو اُس نے خود تعلیم دی تھی اور ہوشیار لڑکی بہت جلد اُردو، انگریزی حساب اور جغرافیہ سیکھ گئی تھی۔ تواریخ اُسے پسند نہ تھی، بادشاہوں کے نام اور سمت یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ تعلیم نے عبداللہ کو اپنی موجودہ

زندگی سے بجد متنفر کر دیا تھا، اور اخباروں کے پڑھنے سے اس کے خیالات خطرناک طور پر سیاسی ہو گئے تھے۔ لیکن پیٹ بڑی بلا ہے، اور اب اُس کی اولوالعزمی، فطرتی ذہانت اور ترقی کی راہیں سب مسدود ہوئی جا رہی تھیں، لیکن بتول بڑھ کر زیادہ وفا شعار، خدمت گزار اور فراخ دل ہو گئی تھی۔ پہلے وہ زیوروں کے لئے تقاضا کیا کرتی تھی۔ اب اُسے اپنے کانوں میں چاندی کی بالیاں بھی بُری معلوم ہُوئیں اور اُس نے انہیں اتار دیا۔ ناک کی بڑی لونگ، چاندی کی اہیل، اور کلائیوں میں پڑے ہُوئے چاندی کے لڑے سب اُتر گئے۔ شاید وہ سونے کے پتلے پتلے بانکے زیور پہن لیتی۔ لیکن سونا حاصل کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا الہ دین کا چراغ۔ اسی لئے تو اب اس کے گدرائے ہُوئے بازو ننگے تھے، اور ستواں ناک، رو پہلی نکیل کے بغیر۔ لیکن، بتول نے شیشے میں یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ زیور اتار دینے سے اس کی شکل نکل آئی ہے، اور اُس کی خوبصورتی پہلے سے دوچند ہو گئی ہے۔ سالگرہ میں آنے کے چند دنوں کے بعد اس نے عبداللہ کو صلاح دی کہ وہ خود ہر گاؤں کے نمبردار کے پاس جائے۔ بلکہ اگر ہو سکے تو ہر ایک کسان کے پاس جائے، اور اس سے کہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل کرے، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ کسان اس کے اپنے بھائی ہیں ہم اور وہ کوئی دو تو نہیں۔ اور پھر اگر وہ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا اور چند دن اور اسکول کی یہی حالت رہی تو شاید سالگرہ کا پرائمری اسکول ہی بند کر دیا جائے اور کسی طرح اور ماسٹر صاحب کو یہاں آنے کی

ترغیب دی جائے۔ بہر صورت اس طرح چُپ چاپ بید کی کُرسی پر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔

عبداللہ دل میں بہت کڑھا۔ تعلیم کے فائدے اُس نے کتابوں میں اتنی بار پڑھے، کہ اس کا یقین تھا کہ جوں ہی اس کا اسکول کھلے گا۔ کسانوں کے لڑکے خود بخود بھاگتے چلے آئیں گے، اور اُن کے ماں باپ اُس کی منتیں خوشامدیں کر کے اُنہیں اسکول میں داخل کرائیں گے۔ لیکن یہاں معاملہ ہی برعکس تھا۔ یہاں ماسٹر جی کو کاسۂ گدائی لے کر گھومنا پڑے گا کہ خدارا اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل کراؤ فیس معاف ہو گی۔ جب چاہو چھٹی ملے گی۔ قاعدے مفت ملیں گے۔ لڑکوں کو پیٹا نہیں جائے گا، انعام اور وظیفے ملیں گے۔ خدارا بچوں کو اسکول میں داخل کراؤ، نہیں تو ایک غریب ماسٹر کی روزی چھن جائے گی۔

دو چار روز گھومنے کے بعد عبداللہ کو پتہ چلا کہ اس میں کسانوں کا بہت قصور نہ تھا۔ صدیوں سے کسانوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ ان کا کام بیج بونا اور فصل کا کاٹنا اور مالک کی اطاعت کرنا اور بس، پڑھنا صرف چند ایک اشخاص کا کام تھا، اور جو کوئی دوسرا پڑھے یا پڑھنے کا ارادہ کرے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ یہ تو برہمن کسانوں کا حال تھا اور مسلمان کسانوں میں بھی مولوی نے تعلیم کے معاملے میں اپنی خود غرض آمریت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ چند لڑکوں کو قرآن مجید کے ایک دو سپارے رٹا دیتا، اور بس، باقی کام وہ نقش سلیمانی اور اسمِ اعظم کے تعویذ دے کر

پورا کر دیتا تھا۔ ان حالات میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے کسان کا دل اور ضمیر تعلیم سے خائف رہا۔ اور اُسے بیج بیج بیج بونے، فصل کاٹنے اور مالک کی اطاعت کرنے سے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ گرد و پیش کے حالات سے آگاہی حاصل کر سکتا اور عبداللہ نے سوچا کہ وہ کسانوں کو گرد و پیش کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے اسباب پیدا کر کے غیر شعوری طور پر چند خطرناک نتائج کو قریب لانے کا ذمہ دار بن رہا تھا۔ یہ جان کر اُسے ایک گونہ خوشی ہوئی اور وہ اور بھی انہماک سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا، اور اُس نے کسانوں کو ترغیبیں دے دے کر اور سبز باغ دکھا کر بہت سے لڑکوں کو اپنے اسکول میں داخل کروا لیا۔

سا گرہ میں جس لڑکے نے سب سے پہلے اسکول میں داخل ہونے کی استدعا کی وہ گلاب تھا۔ لیکن گلاب کو اسکول جانا کبھی نصیب نہ ہوا۔ ست نرائن نے محسوس کیا کہ گلاب کا اسکول میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کالے حرف پڑھ کر گلاب اپنی زمین اور دکان کو واپس لینے کا تقاضا کر سکتا تھا، اور پھر مویشی خانے کا کام کون سنبھالے گا۔ ریوڑ کون چرائے گا دودھ کون دوہے گا اور ایسے ایسے بہت سے کام جو گلاب کرتا تھا، کون کرے گا نہیں، وہ گلاب کو اسکول میں نہیں بھیج سکتا تھا۔ ہاں اُس نے اپنے سب سے چھوٹے دو لڑکے اسکول میں بھیج دیئے۔ گلاب کو بہت مایوسی ہوئی۔ اُس کا دل عبداللہ کو بید کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بیقرار ہو گیا تھا کاش وہ بھی ایک اسکول ماسٹر بن سکتا، اور چار خانے والا آدمی کوٹ پہن کر

اسی گاؤں کے سب لڑکوں کو پتلی بید کی چھڑی سے پیٹ سکتا۔ اُسے گاؤں سے دن بدن نفرت ہوتی جا رہی تھی، یہ گاؤں جہاں سے دُرگا سے محبت نہ کر سکتا تھا۔ یہ گاؤں جہاں وہ اسکول میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہی گاؤں اس کی دنیا تھی اور صدیوں سے اس کی جڑیں اسی زمین میں تھیں اور وہ کہیں نہ جا سکتا تھا۔ باہر کی دُنیا سے وہ ناواقف تھا۔ اسی لیے باہر کی دنیا اُسے ڈراؤنی بھیانک اور خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے تو اس کے قدم ابھی تک ستّے نارائن کے مویشی خانے کے اندر رکے ہوئے تھے۔

لیکن نفرت کے اُس پودے کو جو خود بخود حالات سازگار ہونے کی وجہ سے اُس کے دل میں اُگ آیا تھا، بتول نے بڑی محبت اور محنت سے پالا۔ بتول نے کہیں سے گلاب کی رام کہانی سُن لی، اور جب عبداللہ نے اُسے بتایا کہ کسی طرح سے ستّے نرائن گلاب کو اسکول میں داخل کرانے پر راضی نہیں ہوتا تھا، تو وہ گلاب کی تعلیم و تربیت پر تُل گئی۔

گلاب بھی بہت جلد اُس سے مانوس ہو گیا۔ گلاب کی عمر اس وقت چودہ برس کی تھی اور بتول اُس سے بمشکل چار یا پانچ سال بڑی ہوگی، لیکن بتول کی عقل اس کی عمر سے کہیں بڑی تھی۔ بتول نے گلاب سے کہا: "کوئی مضائقہ نہیں، اگر تم اسکول میں داخل نہیں ہو سکتے، نہ سہی تم میرے پاس اُس وقت آجایا کرو، جب تمہیں فرصت ملے۔ میں تمہیں خود پڑھاؤں گی۔"

اور بتول نے تین سال سچ مچ اُسے نہایت محنت اور شفقت سے پڑھایا، اور گلاب نے بتول کی شفقت میں، ماں، بھائی اور بہن کی اُلفت

کا پہلی اور آخری بار مزہ چکھا، اور وہ اُس سے بھائیوں کی طرح لڑتی، بڑی بہنوں کی طرح جھڑکتی، اور اکثر لمحوں میں اپنے سلوک سے اپنی دبی ہوئی فطری ماماتا کی جھلک دکھا کر گلاب کے دل کو شاد کر دیتی تھی۔ بیشک اس محبت میں درگا کی محبت کی سی جنبیت، گہرائی اور تڑپ نہ تھی اور نہ ہی حقیقی ماں کا سا انوکھا پیار، لیکن گلاب کے لیے جسے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہ تھی، اور جسے حسن و عشق کے آسمانوں میں اڑتے دیکھ کر دُرگا نے اس کا رتیلا کنارہ دکھا دیا تھا، یہی محبت بہت تھی۔ اسی محبت نے اس کے دل میں ساری زندگی بھر انسانیت کا ایمان تازہ رکھا، اور وہ اکثر سوچتا کہ بتول لڑکپن میں اس کے جذبات کے خوفناک دھارے کا رُخ نہ پلٹ دیتی تو وہ بڑا ہو کر خونی اور ڈاکو کے سوا اور کچھ نہ بن سکتا۔ لیکن ان تین سالوں کی صحبت میں اُس نے بہت کچھ سیکھ لیا۔ اوّل تو یہ کہ مسلمان بھی انسان ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ سب انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں، اور یہ کہ ساگرہ کے گاؤں سے باہر جس کی طرف دو طرفیں ہیں، ایک اور دنیا آباد ہے، جس کی چار طرفیں ہیں، شمال مشرق۔ جنوب۔ مغرب۔ زمین گول ہے اور ساگرہ کے لوگ گاؤں کے مینڈک ہیں۔ حاکم لوگ اس لیے حکومت کرتے ہیں کہ لوگ جاہل اور بے خبر ہوتے ہیں علم زندگی کا زیور ہے اور سرکار انگریزی کی برکتیں ہندوستان پر اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ نہ ہی تو وہ گنی جا سکتی ہیں، اور نہ ہی ہندوستان کے لوگ کبھی ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ گلاب ذہین تھا اور پڑھنے کا شوق رکھتا تھا اِس لیے جلد ہی وہ یہ سب کچھ سیکھ گیا اور اُن پر اپنا اعتقاد لے آیا۔

تین سال کے قلیل عرصے میں اُس نے پانچویں تک تعلیم حاصل کر لی، اور جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو عبداللہ نے اُسے بھی امتحان میں شریک کر لیا۔ جہاں وہ سب لڑکوں میں اوّل رہا۔ بتول کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور ماسٹر عبداللہ نے بھی اُسے بہت شاباش دی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُسے دن بھر اسکول کے کام سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ وہ گلاب کو تعلیم دے سکتا پھر بھی اُسے بتول کی خاطر گلاب سے بہت ہمدردی تھی۔ مگر جب بھی اس کے پاس کچھ وقت ہوتا اور گلاب حاضر ہوتا تو وہ ضرور اُسے کام کی باتیں بتاتا۔ لیکن اس کے پاس وقت ہی بہت کم بچتا تھا۔ اوّل تو وہ ادیب فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ تاکہ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو سکے اور وہ کسی مڈل اسکول میں لگایا جائے۔ جہاں وہ بتول کے لیے سونے کے گہنے بنوا سکتا پھر اسکول کے لڑکے بہت شرارتی اور آوارہ مزاج تھے۔ وہ جم کر ایک جگہ کام نہ کر سکتے تھے۔ وہ جنگلوں میں آزاد پھرنا جاتے تھے اور یہاں انہیں گھنٹوں گھٹنوں کے بل اکڑوں ہو کر قاعدہ یاد کرنا پڑتا تھا۔ اُنہیں خوش رکھنے کے لیے عبداللہ کو اسکول میں بہت سی چھٹیاں دینی پڑتیں۔ یا اگر چھٹی نہ دیتا تو لڑکے یہ کہتے ہوئے

ڈھاکے پکے آخرے

میتی کم کے

مُلّا ہو، مری گئے

مُلّانی سر کھے

اسکول سے رفوچکر ہو جاتے اور سیٹیاں بجاتے گھاٹیوں کے مرغزاروں میں آخرے چن چن کر کھاتے۔ ان چھٹیوں کے علاوہ لڑکوں کے والدین علیحدہ چھٹیاں تجویز کرتے

"ماسٹر جی آج میری لڑکی بیمار ہے ذرا ننھے کو چھٹی دے دیجئے۔ ریوڑ کو جنگل میں لے جائے گا۔"

"ماسٹر جی دھان کی پنیری تیار ہے۔ لڑکوں کو چھٹی دے دیجئے۔"

"ماسٹر جی گھاس پیلی ہو گئی ہے لڑکوں کی ضرورت ہے۔"

"لڑکوں کو چھٹی دے دیجئے۔"

اور عبداللہ کو چھٹیاں دینی پڑتیں، اور لڑکوں کے والدین بھی اُسے خوش کر دیتے تھے۔ مکھن، چاول، مکئی اور پھل، لکڑیاں، مرغی، انڈے ماسٹر جی کی نذر ہوتے رہتے۔ اور اگر کوئی لڑکا نذر نہ دیتا تو خود ہی مانگ لیتے۔ سرکار بیوقوف نہیں تھی، جو انہیں دس روپے ماہانہ تنخواہ دیتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ یہ لو دس روپے ماہانہ۔ مجھے پتہ ہے کہ ان دس روپوں میں تمہارا کام نہیں چل سکتا۔ لیکن آخر یہ کسان لوگ کس مرض کی دوا ہیں۔ علم زندگی کا زیور ہے اور جن لوگوں کو تم زندگی کا زیور عطا کرتے ہو۔ کیا ان سے تمہیں یہ معمولی سی چیزیں مانگنے میں بھی شرم آتی ہے؟

لیکن عبداللہ کو سچ مچ یہ چیزیں مانگتے ہوئے شرم آتی تھی اور بتول تو بہت کڑھتی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے تجربے نے انہیں سکھا دیا تھا کہ دس روپوں میں گذارہ نہیں ہو سکتا اور موجودہ زندگی کے چلتے ہوئے تیز دھارے پر پیٹ

اور ایمان دونوں ایک ہی وقت میں سلامت نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لیے تو وہ مکھن اور چاول قبول کرنے لگے تھے، اور اب ایسا معلوم ہوتا کہ گو علم زندگی کا زیور ہے۔ لیکن کسان۔ زندگی کا منبع ہے، اور یہ منبع ہر روز سوکھتا جا رہا تھا۔ گویا انسانیت اپنے ہاتھوں خودکشی کر رہی تھی۔ عبداللہ نے سوچا کہ جب ادیب فاضل پاس کرے گا اور کسی مڈل اسکول میں، کسی اچھے مڈل اسکول میں۔ اچھے معاوضے پر تعینات ہو جائے گا۔ تو کبھی کسان سے نذر قبول نہ کرے گا۔

آخر بتول کی دعائیں رنگ لائیں اور عبداللہ نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ جب وہ ادیب فاضل کا امتحان دینے کے لیے سری نگر روانہ ہوا تو اُس نے گلاب سے بتول کی خبرگیری کے لیے کہا، اور گلاب نے ایسی جاں فشانی سے بتول کے کام کیے، کپڑے دھوئے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا۔ راتوں کو اسکول کے آنگن میں سویا، غرض کہ ست نرائن نمبردار اور دیگر بوڑھے برہمنوں کو پورا یقین ہو گیا کہ اسکول ماسٹر نے گلاب کو مسلمان کر لیا ہے

کے کاموں سے ایسی غفلت شعاری کا ثبوت دیا کہ ست نرائن اور دیگر بوڑھے برہمنوں کو پورا یقین ہو گیا کہ اسکول ماسٹر نے گلاب کو مسلمان کر لیا ہے، چنانچہ اُنھوں نے اسی سلسلے میں ایک عرضی بنام سرکار داغ دی، کہ یہاں کا ماسٹر ہمارا دھرم گنوانے پر تُلا ہوا ہے۔ سرکاری محکمہ میں جب یہ عرضی گھومتی گھومتی آخری حاکمِ اعلیٰ کے پاس گئی تو اُس وقت عبداللہ ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اُسے ترقی دے کر ایک

مڈل اسکول میں تعینات کیا گیا۔ ساگرہ کے گاؤں سے اُس کی تبدیلی ہو گئی اور اس طرح گاؤں والوں کے آنسو بھی پونچھ دیئے گئے۔

بتول کے چلے جانے کے بعد گلاب، چند دن ہی ساگرہ میں رہا۔ اب اُس کا دل ساگرہ کے کنوئیں سے گھبرا گیا تھا۔ وہ صدیوں کی جڑیں اکھڑ چکی تھیں۔ چلتے وقت بتول نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے رُخساروں سے آنسو پُونچھے تھے، اور آنسو پونچھتے پونچھتے خود بھی رو پڑی تھی۔ عبداللہ نے گلاب کو سری نگر میں ایک ہیڈ ماسٹر کے نام چٹھی دی تھی اور کہا تھا کہ اگر وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہے گا تو وہ ہیڈ ماسٹر اُسے دسویں تک تعلیم دلانے میں بہت مدد دے گا۔

چنانچہ ایک دن ست نرائن نمبردار نے گلاب کو غائب پایا۔ مویشی خانے میں ڈنگر چلّا رہے تھے۔ دن چڑھے تک اُنہیں کسی نے نہ کھولا تھا نہ پانی پلایا تھا۔۔۔ نمبردار نے دیکھا کہ گلاب کی چارپائی خالی ہے۔ چارپائی پر اُس کا پھٹا ہُوا کمبل پڑا تھا، اور گلاب کی بنسری، اور ایک کاغذ کے ورق پر لکھا تھا۔ "میں جا رہا ہُوں، پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میری بنسری دُرگا کو دے دی جائے۔ گلاب۔ رائے "

دُرگا کے باپ نے بنسری کو ایک چٹان پر ریزہ ریزہ کرتے ہُوئے کہا۔ "حرامی، میری معصوم بیٹی کو ورغلانا چاہتا تھا۔"

اور ست نرائن نمبردار نے شام کو شیوجی کے گرد پرکرما لیتے ہُوئے پرماتما کا شکر ادا کیا۔ جس نے آج اس کی دولت میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا۔

گلاب کو ساگرہ سے سری نگر پہنچنے میں قریباً ایک مہینہ لگ گیا،

اوّل تو اُسے راستہ ہی معلوم نہ تھا اور پھر اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی کہ وہ راستے میں دیگر مسافروں

کی طرح سامانِ خورد و نوش خرید سکتا۔ اس کے پاس ایک ہی قمیض تھی، اور ایک اُونی فرغل، پاؤں میں دھان کی پولیں، اور ہاتھ میں کاؤ کی ایک ٹیڑھی اور مضبوط لکڑی، لیکن دل میں عزم راسخ تھا اور وہ اپنی زندگی کی شکست کو فتح میں مبدّل کرنا چاہتا تھا، پانچویں جماعت میں اوّل رہنے پر اس کی انانیّت چمک اُٹھی تھی، سویا ہُوا شخصی غرور بیدار ہو گیا تھا اور اس کے سامنے عبداللہ کی مثال تھی، جو اس کی طرح ایک کسان کا بیٹا تھا۔ اور جس نے پہلے دسویں اور اب ادیب فاضل بھی پاس کر لیا تھا۔ پہلے دن اُس نے وہی مکئی کی باسی روٹی اور کڑم کا ساگ کھایا جو وہ ساگرہ سے لایا تھا اور دوسرے دن جب راہ چلتے چلتے اُسے بہت بھوک لگی، تو وہ راستہ سے اُتر کر ایک گاؤں میں اُتر گیا، راستے میں اُسے ہر گاؤں ساگرہ کی طرح نظر آتا تھا۔ اتنا فرق ضرور تھا کہ وادی کہیں کُشادہ ہوتی تھی اور کہیں تنگ، لوگوں کے لباس بھی ایک ہی طرح کے تھے، اور طرزِ گفتگو بھی وُہی، لیکن یہ سب گاؤں مسلمانوں کے تھے۔ کہیں اِکّا دُکّا اُسے برہمنوں کا گاؤں مِل جاتا۔ یا کسی مہاجن کا گھر۔ پہلے تو اُس نے مسلمانوں کے گھروں سے روٹی مانگنے سے احتراز کیا، اور اکثر کسان لوگ اُسے خود ہی کسی اکّے دُکّے برہمن، سِکھ یا مہاجن کا گھر بتا دیتے تھے۔ اکثر گاؤں میں ایک آدھ مہاجن ضرور

ہوتا تھا۔ اس کا گھر باقی گھروں سے ہمیشہ کشادہ اور صاف ہوتا۔ یہ مہاجن عموماً علاقہ پوٹھوہار پنجاب سے آئے ہوئے ہوتے۔ ان کا گاؤں میں رُعب تھا۔ کسان انہیں شاہ جی کہہ کر پکارتے تھے، اور وہ سچ مچ گاؤں کا شاہ بلکہ بادشاہ تھا۔ پٹواری اور فارسٹ کے راکھے اور فارسٹروں کی آنکھیں بھی اُس کے آگے جھکتی تھیں گاؤں کے نمبردار سے لے کر گاؤں کے کمین تک ہر ایک شخص اس کا قرض دار اور احسان مند تھا۔ مہاجن گاؤں کا امدادی بنک تھا۔ مہاجن گاؤں کا بزاز تھا، مہاجن گاؤں کا حکیم تھا اور مہاجن گاؤں کا بنیا اور اکثر اوقات بیج بھی۔ کسان لوگوں کا بال بال اس کے قابو میں تھا، اور پھر بھی کسان لوگوں کے بال بال سے اس کے لیے دعائیں نکلتی تھیں اور وہ یہ حقیقت میں سمجھتے تھے کہ اگر گاؤں میں شاہ نہ ہو تو بھوکے مر جائیں۔ ۔ ۔ ۔ پٹواری اور تحصیلدار کے بغیر گذارہ ہو سکتا تھا۔ لیکن شاہ کے بغیر نہیں۔ تحصیل دار مشیر مال، محاصلات کا افسر اور جنگلات کا بڑا بابو ہر ایک سرکاری کارندہ شاہ کی اہمیت کو سمجھتا تھا اور یہ تو ایک باہمی سمجھوتے کی بات تھی، کہ جب سرکاری کارندے گاؤں میں سرکاری کام پر آتے تو ہمیشہ شاہ جی کے مکان پر ٹھہرتے، اور شاہ جی خوب ان کی خاطر تواضع کرتے، اور جب شاہ جی اپنے مقدمات کے سلسلے میں تحصیل دار یا نائب تحصیل دار کی عدالت میں جاتے، تو کچہری کا ہر فرد اُن سے ادب و احترام سے پیش آتا اُنہیں بید کی کرسی پر بٹھایا جاتا، عمدہ سگریٹ پیش کیا جاتا، اور شاہ جی دبی زبان سے کہتے

"دیکھنا منشی جی۔ تاریخ ذرا نزدیک رکھنا، اگلی پیشی کی تاریخ کہیں دُور نہ رکھ دینا۔ مقدمے کا جلد فیصلہ ہو جائے۔" اور منشی مُسکرا کر کہتا بھلا شاہ جی کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بات ردّ کر دی جائے آپ کون سی تاریخ چاہتے ہیں؟ اگلے مہینے کی پندرہ؛ اچھی بات یہی سہی ایک ہفتہ اِدھر کیا، ایک ہفتہ اُدھر کیا، ایک ہی بات تو ہے۔" اور تحصیل دار صاحب کہتے۔" ہاں ہاں، پندرہ ہی ٹھیک ہے۔ اس وقت ہم بھی دَورے سے واپس آ گئے ہوں گے۔"

لیکن گلاب نے معلوم کیا کہ اکثر شاہ بہت مہمان نواز تھے، اور برہمنوں پر تو وہ اکثر بہت مہربانی کرتے تھے، اور جب انہیں پتہ چل جاتا کہ گلاب برہمن ہے اور تحصیلِ علم کے لیے سری نگر جا رہا ہے، تو وہ بہت خوش ہوتے، اُسے اچھی روٹی کھلاتے اور چلتے وقت ایک دونی بھی برہمن دیوتا کی نذر کر دیتے۔ موضع نکّا کے شاہ جی اس کی اُولوالعزمی پر بہت محظوظ ہوئے، کہنے لگے۔" شاباش، بیٹا شاباش میں تمہاری جرأت پر بہت خوش ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح گھر سے نکل بھاگا تھا۔ ہم چکوال میں رہتے تھے۔ میرے ماں باپ بہت غریب تھے اور میرا باپ گدھوں پر اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتا تھا۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے۔ پھر ایک دن میں لڑ کر گھر سے بھاگ آیا اور یہاں چلا آیا۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا، اور آخر ایک ساہوکار نے مجھے بتایا کہ موضع نکّا بیوپار کے لیے بہت اچھی جگہ ہوگی۔

وہاں ابھی تک کوئی شاہ نہیں بیٹھا، اس نے مجھے ایک نسوار کا ٹین اور نمک اور چند ایک اور ضروری اشیاء ادھار دیں۔ نمبردار نے یہ دکان مجھے عاریتاً دی اور آج دیکھو کہ اپنی محنت و مشقت کے بعد میں اس گاؤں کا شاہ ہوں۔ آس پاس کے علاقے میں میرا بنج و بیوپار پھیلا ہوا ہے کم و بیش چالیس پچاس ہزار روپیہ میں نے باہر ڈیوڑھے پر دے رکھا ہے۔ ہر جگہ میری عزت ہے۔ شادی بھی میں نے کی ہے تین بچے ہیں۔ اب میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ یہ میرا بڑا لڑکا موتی رام تمہاری عمر کا ہو گا۔ یہی اب دکان کا کام چلاتا ہے اب سوچتا ہوں کہ باقی دو لڑکے بھی بڑے ہو جائیں تو انہیں بھی علاقے میں بنج و بیوپار پہ لگا دوں تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بیٹا اولوالعزمی بڑی چیز ہے۔ اگر آج میں چکوال میں بیٹھا رہتا تو گدھے لادتا، جنگلوں کی خاک چھانتا۔ شاید کبھی کسی درندے کا شکار ہو جاتا۔ اب تو میرے پاس لائسنس بھی ہے۔ اے موتی رام بیٹا! میں ذرا پٹواری کے گھر ہو آؤں۔ ان برہمن دیوتا کا خیال رکھنا، اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔ بھوجن وغیرہ اچھی طرح سے کھلانا۔ اچھا رام رام بھیا ۔ ۔ ۔ خوب پڑھو، کبھی اس علاقے میں تحصیل دار بن کر آؤ، تو اس غریب شاہ کو بھی یاد رکھنا۔"

گلاب غور سے موتی رام کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہ کا لڑکا چالیس پچاس ہزار کا مالک، یہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔ موتی رام دبلا سا لڑکا تھا۔ بس اس کا ہم عمر ہو گا۔ یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال، رخساروں کی

ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں، لیکن رُخساروں پر سُرخی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمکتی ہوئیں، یہ لڑکا چالیس پچاس ہزار روپے کا مالک۔ رام رے، اتنے روپے، اس نے آج تک کبھی ایک روپیہ بھی کہیں سے نہ پایا تھا۔ یہ بنج بیوپار بھی خوب چیز ہے اور عبداللہ کی زندگی سے کس قدر مختلف اور ارفع۔ عبداللہ کا کارنامہ اسے بالکل ہیچ معلوم ہونے لگا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دُکان پر ایک نوجوان عورت آئی، موتی رام اسے دیکھتے ہی مسکرانے لگا۔

"سلام چھوٹے شاہ جی"

"سلام نورنشاں، بڑی مدّت کے بعد آتی ہو، شادی جو تھی تمہاری، مبارک ہو۔"

"تمہیں مبارک ہو چھوٹے شاہ جی۔" نورنشاں نے شرما کر کہا اور اس کے رُخسار گلابی ہو گئے۔ نورنشاں نے رنگین اور پھولدار سُوسی کی بھاری شلوار پہن رکھی تھی، اور اسی کپڑے کی قمیص بھی۔ سر پر سُرخ چادر تھی اور چوٹی کے آخر میں نقلی موتیوں کی سبز سبز لڑیاں گندھی ہوئی تھیں، جو اُس کے کندھوں یا گردن کی ایک خفیف سی حرکت سے وجد میں آجاتی تھیں اور ایک روپہلا نغمہ پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے چھلّے تھے اور ایک گلٹ کی سنہری انگوٹھی۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ناک میں سنہری لونگ۔ گو اس کا قد موتی رام سے بھی لمبا تھا، لیکن اب وہ وہاں کی چوکھٹ کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑی

تھی، کہ بالکل ایک کھلونا سی معلوم ہوتی تھی، موتی رام اُسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تارے کی طرح چمکنے لگیں، اور اُس کے موٹے ہونٹ لعاب سے گیلے ہو گئے۔ وہ کچھ کہنے کو تھا لیکن گلاب کو پرے بیٹھا دیکھ کر رُک گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔" اور۔۔۔۔ تمہاری سہیلی سیداں کہاں ہے کیا اس کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ مدت سے اُسے دیکھا نہیں اس مہینہ تو وہ دکان پر نہیں آئی۔ کیا ہم سے کوئی خفگی ہے۔"

نور نشیاں زیرِ لب ہنسی، پھر بولی۔" نہیں، چھوٹے شاہ جی! وہ اپنی خالہ کے ہاں گئی ہے۔"

موتی رام نے کہا" تمہاری شادی بھی ہو گئی اور تم نے ہمارا مُنہ میٹھا بھی نہ کرایا۔ اکبر آ کہاں ہے"؟

"وہ پار (پنجاب) گئے ہیں، خالو کے لڑکے کا خط آیا تھا کہ کسی باورچی خانے میں ایک جگہ خالی ہونے والی ہے۔۔۔۔"

"اچھا۔ اچھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔"

نور نشیاں قدرے توقف کے بعد بولی۔ مجھے تھوڑا سا گُڑ چاہیئے اور چھوارے۔"

موتی رام نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ نور نشیاں کے کندھے پر رکھ دیا۔ آہستہ سے۔ اور بظاہر بالکل لاپروائی سے نور نشیاں پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح جُھک گئی۔ بولا" خوب گُڑ اور چھوارے بھی

ہم ہی دیں اور تمہاری شادی ہُوئی تم نے ہمارا مُنہ میٹھا بھی نہ کرایا کیوں جی
نور نشاںؔ نے بالکل مری ہُوئی آواز میں کہا: "مَیں کیسے مُنہ میٹھا کراؤں
موتی رام نے اُس کے کندھے سے ہاتھ اُٹھا لیا، اور آہستہ سے بولا
"اچھا، جو چاہیئے لے لو، اس طرف اندر آجاؤ اور اپنی پسند کی چیز لے لو
اُدھر سب اچھی چیزیں پڑی ہیں، نیا پشاوری گُڑ آیا ہے۔ شہد کی طرح
میٹھا، تازہ چھوارے اور دودھ کی طرح سفید ناریل اور سونف کے مکھانے
موتیوں کی طرح چمکتے ہُوئے مکھانے۔ آؤ نا"

دیر تک نور نشاںؔ چوکھٹ سے لگی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ موتی رام نے اپنی کانپتی ہُوئی اُنگلیوں سے اس کے بازو کو پکڑ لیا اور اُسے کھینچ کر دکان کے اندر ایک گودام کی طرف لے جانے لگا۔ سبز سبز نقلی موتیوں کی لڑیوں سے ایک جھنکار سی پیدا ہُوئی۔ اور گلاب کو معلوم ہُوا جیسے وہ کوئی نوحہ پڑھ رہی ہو، اور اس کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا۔

بہت دیر کے بعد نور نشان دکان سے باہر آئی، اس کی آنکھیں جھکی ہُوئی تھیں۔ گال تمتمائے ہُوئے اور سُرخ چادر کی جھولی میں چھوارے اور ناریل اور مکھانے بھرے ہُوئے تھے۔

ایک سوُریلی تصویر

جس کی ابھی تک کوئی ابتدا ہے نہ انتہا
اور
جو ہر وقت آنکھوں کے آگے ناچتی رہتی ہے

اس دن میں بہت اُداس تھا، کیونکہ میں نے ایک کتاب میں اُسی روز جرمنوں کے ان وحشیانہ مظالم کا حال پڑھا تھا۔ جو انہوں نے یوکرین کے معصوم بچوں پہ روا رکھے یوں تو ہر آدمی موت کے سامنے معصوم ہوتا ہے۔ اور زندگی کی آخری حد پہ اُس کی حیثیت ایک ننھے سے بچے سے بڑھ کر نہیں ہوتی میں نے بڑے بڑے مجرموں اور پھانسی پہ لٹکنے والے قاتلوں کو موت کی تاریک سُرنگ کی دہلیز پہ ایک ننھے بچے کی طرح مغموم و پریشان دیکھا ہے۔ منہ میں انگلی ڈالے ہوئے جیسے انہوں نے کبھی کوئی جرم ہی

نہ کیا ہو، جیسے ان کی نگاہوں میں اب بھی وہی حیرت و استعجاب باقی ہے جس سے انہوں نے اپنی زندگی کے پہلے روز دنیا کو دیکھا تھا۔

لیکن بچوں کا معاملہ اور ہے۔ اگر عادی مجرم موت کے سامنے اس قدر معصوم ہو سکتے ہیں، تو اس نوزائیدہ کلی کی لطافت کا کیا کہنا، جو ابھی موت اور زیست میں امتیاز ہی نہیں کر سکتی، جس کی دنیا ابھی گناہ اور سزا اور قتل اور خون کے تصور سے ملوث ہی نہیں ہوتی، اس لطافت کو کچلنے کے لیے کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایسی طاقت جس میں انسانیت کی ایک رمق بھی باقی نہ ہو، ایسی قوت جو انسان کے سینے سے نہیں، کسی ذی حس کے سینے سے نہیں، بلکہ ایک سنگلاخ چٹان کی چھاتی سے پھوٹ کر نکلتی ہے، یہ وحشی، بربری قوت انسان کی دنیا میں کیسے آگئی اس دن، اس وقت کتاب الٹ کر میں یہی سوچ رہا تھا، سالہا سال، صدہا برس، پیچھے زمانے کے کہنہ اور شکستہ زینے پر میرا ذہن دوڑتا گیا، ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کے اوراق الٹتا گیا، یہ شقاوت نئی نہ تھی، کبھی اس کا نام جرمنی تھا، تو کبھی روسی، کبھی انگریزی تو کبھی امریکن، کبھی ہندی، کبھی ایرانی، لیکن تھا یہ ہی جذبہ، جو انسان کے سینے سے نہیں، چٹان کی چھاتی کو چیر کر نکلا ہے۔ لیکن آدمیوں کی بستی میں اس کا کیا کام، قرن ہا قرن سے یہ یہاں کیا کر رہا ہے، میں نے، تم نے، اور اُسے، جسے سب لوگ تاریخ کہتے ہیں، اسے اپنے ہاں کیوں جگہ دے رکھی ہے؟

یہی سوچ کر میں اُداس تھا، اور کتاب میں نے الٹ کر تپائی پر

رکھ دی اور اپنی بچی کی طرف غور سے دیکھنے لگا جو میری گود میں لیٹی ہوئی ایک چھوٹی سی کٹوری آلوؤں کا بھرتا نکال کر کھا رہی تھی، مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی، اُس کی ننھی ننھی اُنگلیوں سے بھرتا لگا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا۔" تاؤ "

میں نے کہا۔" نہیں! تم تاؤ"

نہیں! تم۔ اُس نے اصرار کیا، اور اپنی اُنگلیاں میرے منہ میں ڈال دیں اور پھر وہ میری زبان ٹٹولنے لگی۔ بولی۔" تاؤ "

آلوؤں کا بھرتا کوئی بڑی چیز نہیں بچی کا اپنے باپ سے پیار کرنا بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ اتنی معمولی کہ اس سے کسی کہانی سننے والے کو کوئی لطف نہیں آسکتا، مجھے بھی اس وقت کوئی لطف نہیں آ رہا۔ وہی بے کیف اُداسی طاری تھی، اب بھی یاد کرتا ہوں تو وہی بدمزگی تازہ ہو جاتی ہے، آلوؤں کا بھرتا کونین کی طرح کڑوا تھا، کیونکہ یوکرین میں بچوں پہ گولی چلائی گئی تھی، ہاتھوں سے ان کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں، اور ان کی لاشوں کو ننگا کر کے برف پر پھینک دیا گیا تھا، اور یہاں یہ میری بچی مجھ سے کہہ رہی تھی،" تاؤ"۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ آلو کے بھرتے کا؟ کانسی کی کٹوری کا؟ یا اس کی محبت بھری نگاہوں کا،

جس جرمن نے گولی چلائی تھی، جس آدمی نے پہلی بار گولی چلائی تھی جو آج بھی سنگین سے اپنے بچوں کو تہ تیغ کر رہا تھا، اُسے اس محبت بھری نگاہ نے، اسی آلو کے بھرتے، اس کانسی کی کٹوری نے جنم دیا تھا۔ پھر وہ

... معصومیت اور محبت، کیوں کر فنا ہو گئی؟ کیوں کر، کیوں کر؟ میرے خدا!
میں نے بچّی کو صوفے پر لٹا دیا، اور گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ میں ابھی دروازے پر تھا کہ بچّی نے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے ایک میں کانسی کی کٹوری اور دوسرے میں آلو کا بھرتا لیے کہہ رہی تھی "تاؤ۔"
بے وقوف کچھ سمجھتی نہیں، خود جنم لے کر جنم دیتی ہے، آدمی کی ماں بن کر حیوان کی تخلیق کرتی ہے، اب کوئی تجھ سے کیا کہے! "تاؤ" آج آلو کا بھرتا کھلا رہی ہے۔ کل کو گولی چلوائے گی۔ میں نہیں کچھ کھاتا واتا۔"
میں جب اُداس ہوتا ہوں، تو ہمیشہ "غریب گھر" کے سامنے سے گزرتا ہوں، اور شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ میں اس "غریب گھر" کے سامنے سے نہ گزروں، پتہ نہیں۔ لوگ اُسے "غریب گھر" کیوں کہتے ہیں، پھول گیٹ کے باہر پتھر پُل کے اس پار یہ غریب گھر واقع ہے، اس کے سامنے مٹیالی دکانیں ہیں، جن میں جوتے بنانے والے چمار، سائیکل گراموفون اور سنگر مشین درست کرنے والے لوہار، عرضیاں، مثلیں دستاویزیں ٹائپ کرنے والے فن کار کام کرتے ہیں، نکڑ پر اور پل کے قریب ایک ایرانی ہوٹل ہے، جہاں چائے کے گندے پیالوں میں غیر ملمع شدہ چمچے کھڑکھڑاتے ہیں، اور بھورے رنگ کے سیّال میں سے پرانے گڑ کی ہیک آتی ہے، ہوٹل کے باہر ہمیشہ گوشت جلنے کی بُو آتی ہے۔ یہاں لوگ کھڑے ہو کر کباب کھاتے ہیں، اور کباب کھا کر سگریٹ اور پان سے لطف اُٹھاتے ہیں، دو چار پنشن یافتہ بیرے پل پر بیٹھے رہتے ہیں،

اور اپنے انگریز مالکوں کی محیر العقول داستانوں کو ماضی کے کھنڈروں سے کھود کھود کر بیان کرتے رہتے ہیں، دو کوڑھی ایک مرد ایک عورت ہمیشہ قریب قریب بیٹھتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے راہ گیروں کی طرف اسی انداز سے دیکھتے ہیں۔ گویا وہ اُن کی تنہائی میں مخل ہوتے ہوں، کبھی کبھی عورت کوڑھی کے سر پر سے جوئیں چننے میں معروف ہوتی ہے پُل کی محراب کے نیچے دھوبی کپڑوں کو پتھروں پر کوٹتے نظر آتے ہیں۔ اور چھوا چھو کرتے ہوئے اپنی کمر کھجانے لگتے ہیں کبھی کبھی وہ اپنا ہاتھ روک کر نالے کے قریب نیم کے پیڑ سے لگے ہوئے جھولے کی طرف دیکھتے ہیں، جہاں ان کی لڑکیاں اور بہوئیں جھولا جھول رہی ہوتی ہیں، اور ننھے بچے گود میں لیئے عقبی دیواروں پہ چڑیوں کو نشانہ بنانے کی فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں، چھوٹے ۔۔۔ چھوٹے دروازوں والے گھروں کے پنجروں میں سے زرد رُو عورتیں جھانکتی ہیں۔ بھوری عورتیں جنہوں نے ایک عجیب سا گون پہن رکھا ہوتا ہے۔ لمبی ناک والے بچے اپنے پچکے ہوئے گالوں میں کریہہ دانت چھپائے رنگ دار بیلون اُڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ پارسی لوگوں کے گھروں کے باہر دہلیز پر اور دہلیز کے باہر فرش پر کھریا مٹی یا چاک سے پھول پتیاں بنی ہوتی ہیں یہ ہر پارسی گھر کا امتیازی نشان ہیں۔ اس سبز رنگ کے گھر کے باہر جس کی دیواریں چھوٹی چھوٹی ہیں اور جس کی جھکی ہوئی بھوری چھت پر سے بجلی کے کھمبے کے تار گزرتے ہیں۔ مجھے ہر شام کو جب میں اس سمت رُخ

کرتا ہوں، وہ لڑکی دکھائی دیتی ہے، سپید ریشمی ساری میں ملبوس سپید سینڈل پہنے وہ پارسی لڑکی یہاں کھڑی ہوئی ہے، جس کی تبسم کناں آنکھیں مجھے اتنی قدر پسند ہیں، وہ یہاں اکثر کھڑی ہوتی ہے، اس وقت جب میں یہاں سے گزرتا ہوں، یہ بھی اپنا بہترین لباس پہنے اپنے امریکن محبوب کی آمد کی منتظر ہوتی ہے، میں اس طرح آتا ہوں، گویا میں ہی اس کا محبوب ہوں، یہ میری طرف اس طرح دیکھتی ہے، جیسے عمر بھر اس امر کا کوئی امکان نہیں، کیوں نہیں ؟ میں اسے پسند کرتا ہوں یہ مجھے پسند کیوں نہیں کرتی، کیوں نہیں ؟ میں اور امریکن سپاہی دونوں اس کے محبوب کیوں نہیں ہو جاتے ؛ یا ای با کی طرح یہ لڑکی بھی ایک سے دو کیوں نہیں ہو جاتی، فی الفور ؟ اور کیوں جب یہ ایک سے دو ہوتی ہے کوکھ کی اہرامی تاریکی میں نو مہینے تک ایک بیج کی پرورش کرتی ہے اور جب اپنا بدل پیش کرتی ہے تو خود ریشم کے پتنگے کی طرح مرجھا چکی ہوتی ہے، اور راہ گیر، مسافر، اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے والا تماشائی گزر چکا ہوتا ہے !

پتھر کے پل کے اس پار غریب گھر ہے۔ "غریب گھر" میں دو رویہ بارکیں بنی ہوئی ہیں۔ ان بارکوں کا رنگ سیاہ ہے، ان بارکوں کو ایک پارسی لکھ پتی بومن جی گوڈن والا نے تعمیر کرایا تھا۔ "غریب گھر" کیا لکھ پتی ہمیشہ غریب گھر ہی تعمیر کرا سکتے ہیں، کیا بینکر صرف جنگ کرا سکتے ہیں ؟ کیا ایسی دولت سچ مچ زندگی چوس لیتی ہے، اور سیاہ رنگ کی بارکیں تعمیر کرتی رہتی ہے۔ اس غریب گھر کے دروازے پر لوہے کا کٹہرہ ہے اور لوہے کے کٹہرے کے باہر بازار

کی سڑک کو اُس سے جُدا کرتا ہے۔ یہاں میں اس وقت پہنچتا ہُوں جب میرا جی بہت اُداس ہوتا ہے، یہاں غم غلط کرنے کے لیے ایک دوست غم گسار ہستی موجود ہے، یہ ہستی غریب گھر کے اندر نہیں، غریب گھر کے باہر رہتی ہے یعنی اس لوہے کے کٹہرے اور بازار کی سڑک کے درمیان زمین کے اُس ٹکڑے پر جو دونوں غریب گھروں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے۔

یہ ہستی یہاں کیوں رہتی تھی، اس لیے کہ وہ نادار تھی، وہ اس قدر غریب تھی کہ غریب گھر کی بارکیں بھی اُسے پناہ دینے سے عاجز تھیں، اُس کی ٹانگیں نہ تھیں، صرف دو بازو اور ایک سُوکھا ہُوا جسم، جس پر سُوکھے سُوکھے پستان مردہ چوہوں کی طرح لٹکے ہُوئے تھے، چہرے پر لاکھوں جھُریاں چہرہ بھی سیاہ اور آنکھیں بھی سیاہ اور دانت غائب، اور سر کے بال سفید نہیں بالکل سفید نہیں یہ زردی مائل سپید رنگ کے بال تھے۔ سیدھے اُوپر کو اُٹھے ہُوئے، ان میں کبھی کنگھی نہ ہوتی تھی، نہ ہوتی ہوگی، اس کا چہرہ عورت کا سا تھا، لیکن اس کا سر آئین اسٹائین کا سا، یعنی اگر آئین اسٹائین اپنے سفید بالوں میں کبھی کنگھی نہ کرتا تو، اور کسی غریب گھر کے آہنی کٹہرے کے باہر آکر بیٹھتا تو وہ آئین اسٹائین نہ ہوتا، زردی مائل سپید رنگ کے اُلجھے بالوں والی بے دھڑ کی بڑھیا ہوتا!

یہ جسم استخواں میرا دوست تھا، وہ عورت جس کا دھڑ نہ تھا، وہ سر جو آئین اسٹائین کا تھا، وہ آنکھیں جو کسی کی نہ تھیں۔ کم از کم میں نے تو ایسی آنکھیں کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھیں، یہ مت

پوچھو کیا تھا اُن آنکھوں میں، یہ پوچھو کیا نہ تھا ان آنکھوں میں، کائنات کی ساری خوبصورتی اور ہولناکی ان آنکھوں میں سمٹ کر اُتر آئی تھی۔ نجانے کیسے، وہ ہم راز، غم گسار آنکھیں، سب کچھ سمجھ کر معصوم رہنے والی آنکھیں، جیسے آنکھوں نے موت اور زیست کا بھرتا بنایا تھا، اور اب مجھ سے کہہ رہی تھیں "تاؤ" غریب گھر کے باہر دہلیز پہ سونے والی رُوح بھی اس قدر معصوم ہو سکتی ہے، سمجھ میں نہ آتا تھا، شاید اسی لیے دونوں دنیاؤں نے اُسے دھتکار دیا تھا۔ اُس آہنی کٹہرے کے دونوں طرف جو دنیائیں تھیں وہ ان میں سے کسی کی مخلوق نہ تھی، بلکہ ان دونوں کے بیچ میں آہنی کٹہرے سے لگی ہوئی، سمٹی سمٹائی، دو گز زمین پر گھسٹتی ہُوئی وہ اپنے پُر شکن چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیے الگ بیٹھی تھی اور دونوں دنیاؤں کا تماشا دیکھتی تھی، میں نے اُسے کبھی بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ کئی بار میں اس کے سامنے سے گزر گیا۔ اس کی طرف ترچھی انداز میں گھورتا ہُوا گذر گیا۔ لیکن اس نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلائے دونوں دنیاؤں کی دھتکاری ہُوئی کتیا اس قدر مغرور کیوں تھی۔ کیوں، کیوں میرے خدا!

ایک روز میں نے اُسے ایک آنہ دیا۔ اس نے مجھ سے اپنے کشکول میں سے اُٹھا کر سامنے حلوائی کے لونڈے کو آواز دی۔

"اے گڈو! بٹی کے لیے گلاب جامن دے جائیو!"

یہ ٹھاٹھ ہیں۔

دوسرے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا۔
اے گڈو! لعل کے لیے امرتی لے آئیو۔
تیسرے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا۔
اے گڈو! شیریں کے لیے لڈو لے آئیو۔
چوتھے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا۔
اے گڈو! ہولی کے لیے تھوڑی سی ملائی لے آئیو۔

بٹی، لعل، شیریں اور ہولی، چار بچے تھے۔ آدمی کے نہیں، بلی کے، بلی کا نام گل تھا۔ وہ ایک سیاہ و سپید رنگ کا پھول تھی، جس کی ہتھیلیوں میں کانٹے چھپے ہوئے تھے۔ یہ بلی اُس کے سامنے پڑی رہتی، ایک نواب زادی کی طرح مست کاہل اور ٹھوس اور بلی کے بچے اس بڑھیا کے چاروں طرف کھیل رہے ہوتے اور اُس کے سوکھے پستانوں سے اُچھل کر اُس کی ناک پر سے کودتے ہوئے اُس کے سپید گھنے بالوں کے جنگل میں کھیلنے لگتے، ان میں بٹی خاص طور پر بڑی شریر تھی اور بڑھیا کی پیاری تھی۔ میں نے اکثر اُسے اُس کے سر پر ہی دیکھا تھا۔ بٹی کو گلاب جامن بہت پسند تھے۔

اور تم کیا کھاتی ہو۔ جب ہم دوست بن گئے تو میں نے اُس سے پوچھنے کی جرأت کی۔

وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں اِدھر کا اُدھر کا دونوں طرف کا کوڑا کرکٹ کھاتی ہوں۔

تم غریب گھر کے اندر کیوں نہیں رہتی ہو۔

وہاں کرسچین لوگ رہتے ہیں اور غریب پارسی۔

تم کون ہو؟

میں پُوجا ہوں۔

پُوجا؟

ہاں پُوجا! ایک دن میری ماں مجھے اُس غریب گھر کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ اس روز شہر میں گنپتی پُوجا ہو رہی تھی، یہاں ایک کوڑھی بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے مجھے پالا اور میرا نام پُوجا رکھ دیا۔ میری ماں نے گنپتی پوجائی تھی نا، جبھی ایسی سُندر ناری کو اُس نے جنم دیا تھا۔

ہاہاہا۔

کون تھی تمہاری ماں۔

"اپنی ماں سے یہ پُوچھو کہ ماں کون ہوتی ہے میری ماں کو کس نے دیکھا ہے؟" اور یہ ہے بھی سچ۔ کیونکہ پُوجا کی ماں کو کس نے دیکھا ہے؟ وہ تاریکی کی چادر اوڑھے، پربھات کی پہلی چھاؤں میں جب آکاش پر تاروں کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے یہاں ہولے ہولے قدموں سے آئی تھی۔ جب کوڑھی بھی سو رہا تھا۔ اس وقت وہ دیوی آئی تھی، جس کا دل لوہے کا تھا اور اسی لیے وہ لوہے کے پاس آئی تھی، اور اس نے اپنی بیٹی کو لوہے کے کٹہرے حوالے کر دیا اور پھر اُسی پربھات کی چھاؤں میں گم ہو گئی تھی۔ کیونکہ گنپتی نے اُسے جو بیٹی دی تھی، اس کا دھڑ

نہیں تھا اور اُس کے بال جنم سے سفید تھے' پتہ نہیں یہاں وہ مُونڈر لگانا کیسے بھُول گئے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی ناک تھپتھپانے لگی، پھر مسکرا کر بولی۔
"کہتے ہیں گنپتی پوجن کے روز میں کوڑھی کی کتیا کے گرم جسم سے لگ کر اور اس کا دودھ پی کر پڑی سوتی رہی۔ جب کوڑھی اُٹھا، جب بھی سو رہی تھی، اور مندروں میں گنپتی پوجن ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور پُوجا! سمجھے؟ اس کی آنکھیں جیسے ہنس رہی ہوں۔
میں اُس روز چپکے سے چلا گیا۔ کیونکہ اُس کے بوڑھے چہرے پر... وہ آنکھیں اب بھی اُسی طرح جوان تھیں۔ وہ آنکھیں جو میری محبوب کی آنکھوں کی طرح تبسم کناں تھیں۔ نہیں، نہیں۔ یہ وہ عورت نہیں ہو سکتی وہ تو پتھر کے پُل کے اس پار ہے۔ یہ اُس پار۔ ای باکے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ دو شخصیتیں بن سکتی ہیں۔ لیکن یہاں تو پتھر کا پُل بیچ میں حائل ہے۔ نہیں، نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا، پھر یہ آنکھیں اس قدر جوان کیوں ہیں؟ اس قدر فہمیدہ، اس طرح ہر وقت ہنسنے والی نگاہیں۔۔۔ ۔۔۔ کیوں، کیوں؟ میرے خدا!

لیکن اُس روز کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے وہ کوڑا کرکٹ کھا کر مغرور تھی، اور بتّی، لعل، شیریں اور ہولی کو مٹھائی کھلا کر خوش تھی، اور اُسے آج تک کسی سے بھیک مانگتے نہ دیکھا تھا۔ وہ جس کا نام پُوجا تھا، اور جو ایک کوڑھی کی پروردہ تھی۔ اور اس لیے وہ خوش رہتی تھی۔ میں نے اُسے کبھی مغموم، کبھی اداس نہیں دیکھا۔ اس لیے

جب بھی میں اُداس ہوتا تھا۔ ہمیشہ اُس کے پاس آتا تھا۔ چند منٹ اُس سے باتیں کر کے چل دیتا تھا۔

ایک دن میں نے اُس سے پُوچھا۔ تم اس قدر خوش کیوں ہو۔

کیوں کا کیا مطلب ؟

یعنی میں نے تو تمہیں کبھی اُداس نہیں دیکھا۔

اس کی آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگیں، سر کے بال اور بھی اُوپر کی جانب کھڑے ہوتے گئے۔ جیسے ان کی جڑوں میں برقی بٹن لگے ہوں، بولی، کوڑھی بابا ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ اُس کی ٹانگ پر کوڑھ تھا۔ میں ہمیشہ ہنستی تھی کیونکہ میرے دھڑ نہیں ہے۔ نہ میں چل سکتی ہوں، نہ بچے پیدا کر سکتی ہوں، ہا ہا ہا، گلاب جامن کھاؤ بٹی۔ پھر بھی دیکھو، میرے بچے کتنے پیارے ہیں۔ ادھر آؤ۔ لعل، شیریں، ہولی، بتلی۔ بتی۔ بٹیا ؛ وہ اپنے ہاتھوں سے اُنہیں اُچھالنے لگی، اُس کی کشکول میں تھوڑا سا دودھ پڑا تھا، اور قریب ہی زمین پر ڈبل روٹی کے چند باسی ٹکڑے

یہ کس کے لیے، میں نے پُوچھا۔ تمہارے لیے ؟ آج کل تو عیش کر رہی ہو اس جنگ کے زمانے میں تو ہمیں بھی دودھ نہیں ملتا۔

وہ بولی، یہ میرے لیے نہیں، گل کے لیے ہے۔

میں نے گل کی طرف دیکھا، وہ لال رنگ کے کپڑے میں سمٹی ایک تکلیف دہ لہجے میں خُرخُر کر رہی تھی۔

گُل کو کیا ہُوا ہے ؟ میں نے پُوچھا۔

وہ مسکرا کر کہنے لگی "جھول دے گی۔ دو ایک دن میں"

میں نے دو آنے کشکول میں ڈال دیئے۔ وہ ایک آنہ مجھے واپس کرتے ہوئے بولی "نہیں، تم سے ایک آنہ ہی لیتی ہوں۔ یہ لے جاؤ۔ پر کل آنا ......گنپتی پوجن ہے۔ کل میرا جنم دن ہے ہا ہا ہا، مٹھائی کھلاؤں گی۔ اُجلے کپڑے پہن کر آنا اور حجامت بنوا کر آنا ......

....

بچی، بھڑتے اور "تاؤ" کو چھوڑ کر جب میں نے عزیب خانے کا رُخ کیا تو راستے میں ڈھول، تانشوں اور بیل گاڑیوں کا ایک غول بیابانی ملا۔ عورتیں زیوروں سے لدی پھندی تھیں، بیل گاڑیاں پھلکاریوں سے سجی تھیں، بیلوں کے سینگوں پر سنگوٹیاں چڑھی ہوئی تھیں، اور بیلوں کے جسموں کو نسوانی ہاتھوں نے رنگا رنگ نقش و نگار سے سجایا تھا آج گنپتی پوجن تھا اور اس لیے آج عورتوں کی آنکھوں میں کاجل گہرا تھا لبوں پہ گیت تھے، اور سینوں میں اک نامعلوم سی تھرتھری، جیسے کسی انجانے ان دیکھے۔ ان بوجھے محبوب سے گلے ملنے کی تمنا ان کے سینوں کو ٹٹول رہی ہو۔ ڈھول کے شور میں گنپتی پوجن کا گیت ہو رہا تھا... پھول گیٹ پر بندھن واریں.... اور پل کے اس پار تیری تبسم کناں شبنم فشاں آنکھیں جانتا ہوں، تجھے میرا انتظار نہیں ہے، جانتا ہوں کہ تیرے سینے کے عنبر کو میری نگاہوں کے شعلے نہیں چھو سکتے، جانتا ہوں کہ تیری گردن کے خم کی ملائم بر فیلی لذت سے میری انگلیوں کا لمس ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے ناآشنا رہے گا، اور میں تنہا، بھوکا، پیاسا اس پتھر کے پل پر سے گزر جاؤں گا۔ ایک گداگر جو دوسرے گداگر سے ملنے جا رہا ہے۔

پتھر کے پل کو اُس پار وہ بیٹھی ہے، ہنس رہی ہے، بلی کے بچوں کو کھلا رہی ہے، آج گنپتی پوجن ہے اور اس نے ہر بچے کے گلے میں لال نیلے پیلے اودے رنگوں کے چیتھڑے باندھے ہیں آج بھی بتّی اس کے سر پہ بیٹھی ہے اور بتّی کی گردن میں ایک خوش رنگ بو لگی ہے۔

میں نے اُس خوش رنگ بو کی طرف اشارہ کر کے کہا: "تم نے یہ فیتہ کہاں سے لیا؟"

وہ بولی: "اس لڑکی سے لیا ہے جس کی طرف تم ہر روز گھور گھور کر دیکھتے ہو۔"

جھوٹ! میں نے کہا۔

نہیں سچ کہتی ہوں، اُسی سے مانگ کر حاصل کیا ہے، عمر میں آج پہلی بار بھیک مانگی ہے۔

کیوں؟

" بولی۔ آج گنپتی پوجن ہے، اور مجھے اس کی آنکھوں میں ——— وہ چپ ہو گئی، نجانے کیا کہتی۔ اس وقت لبوں پہ ایک پُراسرار تبسم تھا۔

کہو۔ کہو۔

وہ ایک عرصے کے بعد بولی کچھ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ جانتے ہو، آج تمہیں مٹھائی نہیں کھلاؤں گی۔ گو وعدہ تھا۔

ہاں، پر کیوں نہیں !

گل مر گئی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔" اور بچوں کو بہت بھوک لگی ہے
میں نے دیکھا گل ایک کونے میں لال رنگ کے کفن میں مستور غریب گھر
کی دیوار سے لگی پڑی ہے۔

"اور اس کے پیٹ کے اندر جو بچے تھے ؟" میں نے پوچھا۔ اور
بچی سے پیار کرنے لگا۔

بس کو کھ اندھی ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔

بڑھیا کے سر سے اُچھل کر سڑک کی طرف بھاگی۔ اُدھر سے ایک
موٹر آ رہی تھی، تیزی سے
ارے۔۔۔۔۔۔

آنِ واحد میں میں نے اُسے سڑک کے بیچوں بیچ گھسٹتے دیکھا۔ بس ایک
لمحے کی بات تھی اور پھر موٹر کا پہیّہ اس کے سر پر سے گزر گیا۔ چیخ کی سی آواز
آئی، پھر بریکوں کا شور، بھاگم بھاگ، لوگوں کا مجمع، ہجوم کے مختلف سُر۔۔۔
پہلے چند لمحے تو میں گویا زمین میں گڑا رہا۔ پھر تیزی سے بھاگا، اور ہجوم کو چیر
کر اُس تک پہنچا، اور اُسے پہیئے سے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔
لیکن جب تک اُسے باہر نکالا جاتے وہ مر چکی تھی، اور اس کی گردن اور
اس کے بازو اندر کی جانب مڑے ہوئے تھے؛ وہ آئین سٹائین کا سا سُر
پچک گیا تھا، اور بھیجا سپید ملگجے بالوں کے باہر اُبل رہا تھا۔
میں نے اُس کی گردن کو سیدھا کرنے کی کوشش کی، اور اُس کے

بازو الگ کیے۔ تو دیکھا کہ اُس نے اپنے سینے اور بازوؤں کے درمیان میں بلّی کو چھپا رکھا ہے، بلّی اس کے مردہ سینے سے لگی تھی، اور اس کی آنکھیں بند تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیچاری مرگئی یہ بھی میں نے اُسے آہستہ سے چھوا تو وہ ایک دم اُچھل کر ایک طرف ہوگئی، اور بولی "میاؤں میاؤں" اب بلّی چاروں طرف دیکھنے لگی، پھر وہ بڑھیا کا سر سونگھنے لگی، اور اس کے سر کے گرد طواف کرنے لگی اور بے چینی سے کہنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میاؤں، میاؤں"

کار میں ریڈیو ابھی تک بند نہ ہوا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "یوکرین کی فوجوں نے دشمن کو اپنے علاقے سے باہر نکال دیا۔ اب یوکرین آزاد ہے، دشمنوں کے چنگل سے آزاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

بٹن گھما کر کار کے مالک نے ریڈیو بند کر دیا۔

لوگ سوال کر رہے تھے۔ یہ سڑک کے بیچ میں کیسے آگئی، لوگ پوچھ رہے تھے، اس بے دھڑ عورت کے پاؤں کہاں سے آگئے تھے، کس طرح وہ ایک بلّی کے بچے کو بچانے کی خاطر عین سڑک کے بیچ میں آن پہنچی تھی، وہ جو دن بھر میں ایک گز بھی نہ چل سکتی تھی کس طرح چند لمحوں میں اس فاصلے کو طے کر کے موٹر کے پہیوں میں آن گھسی تھی۔

عجیب سوریلی منظر تھا وہ، وہ سپید مٹیالے سے بال، پُر شکن چہرہ بے دھڑ جسم، سوکھے پستان، اور بلّی کی گردن میں رنگین فیتہ، اور بھیا بالوں سے باہر، ایسی تصویر تو غالباً پکاسو نے بھی نہ بنائی ہو گی،

ڈالی کے ذہن میں بھی ایسا محیّر العقول مرقع نہ آیا ہوگا ۔۔۔۔۔ میں مسکرانے لگا۔ کیونکہ یہ رونے کا مقام نہ تھا۔

لوگ پوچھ رہے تھے، یہ کیسے ہُوا، یہ کیسے ہُوا، یقیناً یہ ایک معجزہ تھا۔ ایک معجزہ۔

یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ کوئی میرے دل کے اندر بار بار کہہ رہا تھا۔ ایک معجزہ تھا۔ لیکن یہ معجزہ نہیں ہے کہ پوجا نے بلّی کے بچّے کو اپنی جان دے کر بچایا ہے۔ معجزہ شاید یہ ہے کہ اس نے تمہاری بچّی کو بچایا ہے۔ اس داڑھی والے بزرگ کی بچی کو بچایا ہے، اس ادھیڑ عمر کے درزی کی بچّی کو بچایا ہے۔

پُوجا نے شاید ان تمام

بچیّوں کو بچانے کی سعی کی تھی جن کی معصومیّت شب و روز اُن سے چھن رہی ہے، جن کی آنکھیں شب و روز ظالم ہاتھوں سے نکالی جاتی ہیں، جن کے سینے میں شب و روز دشمن کی گولیاں پیوست ہوتی ہیں۔

لوگ کہہ رہے تھے۔ کمبخت نے ایک بلّی کے بچّے کو بچانے کے اپنی جان دے دی۔

"میاؤں، میاؤں"

کمبخت گدا گر عورت ۔۔۔۔۔!

میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُس وقت اُن لوگوں سے کچھ کہوں،

میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں بتاؤں میں کیا کہنا چاہتا تھا ان سے، میں اُن لوگوں سے یہ کہنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں یہ وہی گداگر عورت ہے جسے دنیا نے کچھ نہ دیا تھا جسے اس کی ماں نے اپنی تخلیق پر شرمندہ ہو کر آہنی کٹہرے کے حوالے کر دیا تھا۔ جسے ایک کوڑھی نے پالا تھا، وہ جس کی ٹانگیں نہ تھیں۔ جس کا دھڑ بیکار تھا، جس کی کوکھ اندھی تھی، وہ آج مر گئی تھی۔ ایک بچّے کے لیئے ایک حسین خیال کے لیے، ایک سہانی اُمید کے لیے، اگر یہ موت ہے تو صلیب کسے کہتے ہیں۔ زندگی کسے کہتے ہیں۔ حیاتِ جاوداں کسے کہتے ہیں؟ کیا تم اس عورت کے چہرے کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکے، اس کی آنکھوں کا روشن تبسّم نہیں پہچان سکے، جو ہر دم، ہر لمحے۔ ہر صدی، تاریخ کے ہر صفحے پہ انسان کی محبّت کے راگ گاتا ہے اور معصومیّت کے اس سرچشمے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو شب و روز انسان کے سینے میں سوکھتا جاتا ہے۔

"میاؤں۔ میاؤں"

یکایک میرے دل پر ایک عجیب کیکپی سی طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہُوا، جیسے میں خود بھوکا تھا۔ ننگا تھا۔ پیاسا تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ جیسے یہ سب لوگ میری طرح بھوکے، ننگے، پیاسے تھے، اور اس گداگر عورت نے ہمیں کپڑے پہنائے تھے ہمارے بالوں میں کنگھی کی تھی، اور انہیں لال پیلے نیلے فیتے سجا کر ہمیں اپنے پر بٹھایا

تھا، اور میں اپنے آپ سے اور ان تمام لوگوں سے جو اک ہجوم کی صورت میں اس بڑھیا کے گرد جمع تھے کہنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے نہیں۔ اسے دیکھتے نہیں ہو۔ آج محبت نے موت پر فتح پائی ہے۔ آج ظلم کا جال ٹوٹ رہا ہے۔ آج آزادی کا راگ بج رہا ہے۔ یوکرین میں دشمن پیچھے ہٹ رہا ہے اور معصوم بچے آگے بڑھ رہے ہیں، بلی کے بچے ۔ آدمی کے بچے ....

"میاؤں ۔ میاؤں "

میں اُن سے یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ۔ لیکن میں اُس کو کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وہ لوگ اجنبی تھے۔ وہ لوگ بڑھیا کو جانتے نہ تھے، وہ اُسے احمق سمجھ رہے تھے اور ریس جانے کی تیاری کر رہے تھے اور تیوہار کی خوشیوں میں مگن تھے۔

اور کار کا مالک کہہ رہا تھا "اس حرام زادی کو آج ہی مرنا تھا اسی وقت، اب ریس میں جانے کے بجائے تھانے میں جانا پڑے گا۔"

اور پولیس کا سپاہی بھنگی سے کہہ رہا تھا " ارے اُس چیتھڑے کو اس کمبخت بڑھیا کے سر پہ ڈال دو، اور اسے سڑک کے کنارے رکھ دو۔ ابھی تھوڑی دیر میں بیل گاڑی آتی ہوگی"

کول ---- کمل --- - -

ڈیوک ڈیوک ---------

اسپورٹنگ ٹائمز -----------

لڑکے چیخ چیخ کر اس کے پمفلٹ فروخت کرتے ہوئے ادھر آ رہے تھے۔ لوگ جلدی جلدی جیب سے نقدی نکال کر پمفلٹ خریدنے لگے۔ اب اُن کے ذہن میں گھوڑے، جاکی اور نوٹ کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔

ایک بازاری کتا دم ہلاتے ہوئے کار کے قریب آیا، پہلے اس نے دائیں طرف کے پچھلے پہیے کو سونگھا اور وہاں ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر دیا۔ پھر وہ دوسرے پہیے کی طرف گیا، اور وہاں بھی اسی طرح پیشاب کیا۔ پھر وہ تیسرے پہیے کی طرف گھوم گیا، اور اُسے سونگھ کر اور ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنے لگا۔ پھر وہ چوتھے پہیے کی طرف مڑا اور پیشاب کر کے دُم ہلاتا ہوا چلا گیا۔ لوگ بھی پمفلٹ خرید کر جا چکے تھے۔

پولیس کا آدمی کار کے مالک کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور کار چل دی۔

سڑک کے ایک کونے میں ایک لال پیلے نیلے اودے رنگوں والا چیتھڑا اُبھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"میاؤں، میاؤں۔"

مندروں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"کوں --- کوں!"

ڈیوک ..... ڈیوک ....."

اسپورٹنگ ٹائمز .....

یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں چٹانوں کے بیچ میں کھڑا ہوں دنیا کی کوکھ اندھی ہو چکی ہے۔ اور آج گنپتی پوجن ہے!

آتا ہے یاد مجھ کو!

۱۹۲۰ء کے موسمِ بہار میں میں نے اپنی عمر کے ساتویں سال میں قدم رکھا۔ ان دنوں ہم لوگ انگپور کی وادی میں رہتے تھے، جس کا شمار اب بھی کشمیر کی حسین ترین وادیوں میں ہوتا ہے، لیکن مجھے ان دنوں اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی، اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں، ہم لوگ یہاں نئے نئے آئے تھے۔ میں اور میرا بڑا بھائی رام اور ماں جی اور پتا جی اور کامنی موسی جس کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ تھی، پھر یہاں اسکول میں —— لڑکے مجھے ایک امیر آدمی کا بیٹا جان کر قابلِ نفرت سمجھتے تھے، اور موقع پا کر پیٹ دیا کرتے، اس کے علاوہ میں اسکول میں غالباً سب سے کند ذہن تھا، اس لیے بھی دونوں اُستاد مدرس اوّل اور مدرس دوم دونوں مجھ سے ناخوش تھے، کوئی مونس وغم خوار نہ تھا، جو سات برس کے لڑکے سے ہمدردی

ظاہر کرتا۔ ماں جی پتا جی کی دلداری میں مصروف رہتیں، آج پھر نوُ لے کھٹے آلوچے کھائے ہیں، ٹھہر تو سہی ۔۔۔ اور پھر وہ میرا گلا دبوچ کر مجھے اپنی رانوں پر لٹا کر، میرا منہ کھول کر اس میں جوشاندہ ٹپکاتیں، جو اس گھاٹی میں اُگے ہوئے بنفشے سبز چرائتے، سنبلو کی جڑوں اور نہ جانے کس بلا بتر سے تیار کیا گیا تھا، اوہ! کس قدر تلخ، بکھٹّا اور بدذائقہ ہوتا تھا، وہ جوشاندہ ۔۔۔ اور جب کامنی موسی میری ناک پکڑ کر مجھے زمین پہ گرا دیتیں، یا اپنی گود میں ڈھکیل دیتیں، اور میں غلو غلو غلو کرتے ہوئے جوشاندے کو حلق سے نیچے نہ اتارنے کی کوشش کرتا، اور اسی ناکام کوشش میں موسی کامنی کے انگوٹھے کو چبانے میں کامیاب ہو جاتا تو جوشاندہ پی لینے کے باوجود پیٹا جاتا۔ اس دنیا میں انصاف کہاں ہے؟ کوئی ایک غریب سات برس کے بچے کی نہیں سنتا ۔۔۔!

انہی باتوں سے چڑ کر ایک دن میں نے سوچا کہ میں اب اسکول نہ جاؤں گا، بلا سے جو ہوگا دیکھا جائے گا، آخر ایسا بھی کیا، ہمارا بھی اس دنیا میں رہنے کا اور اپنی سی کر گزرنے کا حق ہے۔ چنانچہ میں نے یہ سوچ کر جلدی سے سلیٹ، کاپی اور کتاب کو جز دان میں بند کیا، اور تختی بغل میں داب کر اسکول کی راہ لی۔ تھوڑی دُور چل کر جب گھر ٹینگیوں کے جھنڈ میں اوجھل ہو گیا، تو میں نے اسکول کا راستہ چھوڑ کر دوسری پگڈنڈی پہ چلنا شروع کیا جو گھاٹی سے نیچے اُتر کر ندی کے کنارے کنارے دھان کے کھیتوں تک جاتی تھی، جہاں پن چکیاں

نھیں، چشمے تھے، سبزہ تھا، جہاں دن بھر چرواہے اور چرواہیاں ریوڑ چرواتے تھے۔

اسکول سے اور گھر سے بھاگنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لیے کچھ خوش خوش، کچھ سہما سہما، کچھ آزاد سا، کچھ اُداس سا چلا جا رہا تھا، اپنی دُھن میں اور سوچ رہا تھا کہ اس بستے کو کہاں رکھوں، اسے لیے لیے پھرنا تو بڑی حماقت ہوگی، کوئی دیکھ لے گا، تو پکڑ کر سیدھا اسکول لے جائے گا، یا گھر، اب کیا ہو۔ اس بستے کو کہاں چھپاؤں، جب گھاٹی کے زیریں حصے کی طرف پہنچ گیا تو میں نے اپنے بستے کو اور تختی کو داخ کے ایک بڑے جھاڑ میں چپکے سے رکھ دیا۔ یہاں لانبی لانبی گھاس اُگی ہوئی تھی، اور زمین پر جو بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اُن پہ نیلے نیلے اور ہلکے قرمزی رنگ کے پھول آئے تھے جو چوڑے چوڑے پتّوں کے درمیان گراموفون کے اس بھونپو کی طرح نظر آتے تھے کہ جس کے سامنے سفید رنگ کا ایک کتا بیٹھا ہوتا ہے۔۔۔ یکایک مجھے ایک خوبصورت گلہری نظر آئی اور میں اُسے پکڑنے کی کوشش میں داخ کی بیل پر جو منّو کے پیڑ پہ بل کھاتی چلی گئی تھی، اُوپر چڑھتا چلا گیا، پھر گلہری مجھے چکمہ دے کر کہیں ان چوڑے چوڑے پتّوں میں گم ہو گئی، اور میں داخ کے ان خوشوں کو ٹٹولنے لگا، جن کے دانے ابھی زمرّد کی طرح سبز تھے، اور اتنے ہی سخت، داخ کے ایک دو دانے میں نے توڑ کر کھائے، بڑے ہلکے اور کڑوے تھے

اور بیج جو زبان پر آکر ٹوٹ گیا تو کونین کی گولی کی طرح تلخ معلوم ہُوا، تلخ اور گلے کو گھونٹتا ہُوا۔ میں نا اُمید ہو کر بیل سے نیچے اُتر آیا۔ قمیض ایک کہنی کے قریب پھٹ گئی تھی، اور پاجامہ بھی گھٹنوں کی رگڑ سے دو بڑے بڑے بھورے داغ لیے تھا۔ نیچے اُتر آیا، جمائی لی، اُف کس قدر اُداس ہے یہ دُنیا۔ اُن دنوں میں شاعر نہ تھا، افسانہ نویس نہ تھا، پڑھا لکھا نہ تھا، ان دنوں نہ شفق میں خوبصورتی تھی، نہ ہَوا میں لطافت، نہ گھاس میں سوندھی سی خوشبو، پھول، پھُول تھے توڑنے کے لیے، گلہریاں پکڑنے کے لیے، تیتریاں پیچھے بھاگنے کے لیے، عورتیں جو شاندہ پلاتے اور ناک مروڑنے کے لیے، اور انگوٹھا چباتے کے لیے، مرد چبتانے کے لیے اور کان پکڑ کر اسکول لے جانے کے لیے مامور کیے گئے تھے، اس لیے میں نے زور سے اک جمائی لی اور سوچا کہ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اب نہ گھر جا سکتا ہُوں۔ نہ اسکول، میں نے سوچا کیوں نہ میں ان پہاڑوں سے پرے کہیں دُور چلا جاؤں، جہاں اچھے لوگ بستے ہیں، جہاں شہزادے اور شہزادیاں رہتے ہیں، جہاں جادُوگر محل بناتے ہیں، اور پریزادے ہنس کے پروں پر نیلی جھیلیں پار کرتے ہیں، ہاں۔ بس یہ ٹھیک ہے!

یہ سوچ کر میں داخ کے جھنڈ سے نکلا اور گھاٹی کی ڈھلوان کی طرف بڑھا، گراموفون کے بھونپوؤں کو اپنے پاؤں سے کچلتا گیا۔ جوتا اتار کر میں نے اپنے بستے کے قریب رکھ دیا۔ کیونکہ اب نرم نرم گھاس

پر ننگے پاؤں چلنے میں لطف حاصل ہو رہا تھا۔ میں نے زور زور سے سیٹی بجانا شروع کی، کامنی موسی مجھے اس وقت سیٹی بجاتے دیکھ پاتیں، تو کیا کہتیں ۔۔۔۔۔۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کامنی موسی کہیں نظر نہ آئیں ۔۔۔۔۔ اوہ! مجھے کیا پرواہ ہے ۔۔۔۔ میں نے اطمینان سے پھر سیٹی بجانا شروع کی۔ یکایک قریب سے کسی نے مجھے زور سے ڈانٹا اور میں خوف سے اُچھل کر بھاگا، پھر مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کامنی موسی نہ تھیں، ایک شریر ماہی مار تھا جو اب ہوا میں چیختا ہوا شوخی سے پر کھولتا ہوا پر بند کر کے ہوا میں ڈبکیاں لیتا ہوا۔ اڑا چلا جا رہا تھا۔ کمبخت نے مجھے یوں ہی ڈرا دیا تھا۔ میں نے زمین سے کنکر اٹھا کر اُسے مارنا شروع کیا، لیکن ایک کنکر بھی اسے نہ لگا اور وہ قہقہے لگاتا ہوا، مزے سے اڑتا ہوا ندی کی طرف چلا گیا۔ جانے دو بچہ جی کو جب ہم جادوگر سے جادو کی چھڑی چھین کر لائیں گے، پھر اس شیطان ماہی مار سے پوچھیں گے کہ اس طرح چلتے چلتے لوگوں کے سر پر کھڑے ہو کر چیخنے کا کیا مطلب ہے؟ ڈھلوان کے آخر میں، گھاٹی کے دامن میں دو چشمے بہہ رہے تھے۔ یہاں گاؤں کی لڑکیوں کا اکثر جھمگٹا رہتا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہاں کسی نے مجھے گھومتے ہوئے دیکھ لیا تو رپورٹ ہو جائے گی، اس لیے میں نیچے کی طرف جاتا جاتا رک گیا، اور پھر رُخ بدل کر گھاٹی کے درمیان سنبلو کی جھاڑیوں اور کاؤ کے درختوں میں اپنے آپ کو چھپاتا ہوا چلنے لگا۔ نیچے میں ان دو چشموں کو صاف دیکھ سکتا تھا، جہاں سے لڑکیاں گھڑے بھر بھر کر لیے جا

رہی تھیں، لیکن میرا راستہ اُن کے راستے سے الگ تھا، اور دونوں راستے گویا ایک دوسرے کے متوازی چل رہے تھے، جی میں آیا کہ دو چار پتھر اُٹھا کر دے ماروں اور گھڑے پھوڑ دوں۔ تڑاخ سے گھڑے پھوٹ جائیں گے، اور بھک سے سارا پانی لڑکیوں کے کپڑوں کو شرابور کرتا ہوا نیچے گر جائے گا، پھر سوچا اگر کسی نے مجھے پکڑ لیا تو —— اور مجھے ابھی دُور —— بُہت دور پریوں کے دیس جانا ہے، کہ جس کی کہانی مجھے اکثر رات کو کامنی موسی سنایا کرتی ہیں، اور جو ان کے کہنے کے مطابق اس سلسلہ ہائے کوہ کے پرے واقع ہے۔ میں سوچ کر رُک گیا۔ جھاڑیوں میں دو گُلائیں خوشی سے چیخیں اور پھر سے اڑ گئیں، ایک اور گلہری نظر آئی جو کاؤ کے ایک پتلے سے ٹھنڈ سے لگی مجھے مقابلے کی دعوت دے رہی تھی، لیکن اب تو میرے پائجامے کے پائنچے بھی اوس سے گیلے اور کانٹوں سے تار تار ہو چکے تھے، اس لیے میں نے آگے بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ بالکل سامنے ایک خوبصورت چکور، موٹا موٹا چتکبرا چکور مزے سے ٹہلتا ہُوا جا رہا ہے، عین سامنے، بالکل راستے میں، میں اُسے دیکھ کر رُک گیا اور ایک ستنے کی اوٹ میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اُسے کس طرح پکڑا جائے، پھر سارے داؤں سوچ کر میں آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل چلنے لگا، تاکہ ... آہٹ نہ ہو، ہر لمحہ مجھے اُس کے قریب لا رہا تھا۔ یکایک چکور نے گردن موڑ کر مجھے دیکھ لیا، اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے اپنے پروں کو اک ہلکی سی جنبش دی، اور میں نے

نا اُمید ہو کر سوچا کہ اب یہ اُڑا۔۔۔۔ لیکن میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب وہ مجھے دیکھ کر بھی بدستور اپنی چال سے چلتا رہا۔ میں نے سوچا ضرور یہ چکور جانور کسی کا پالتو ہے، اور چھوٹ گیا ہے، یا پھر یہ ابھی بچہ ہے جو اُڑ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ زخمی ہو۔ کسی لڑکے نے گوپھیا مار کر اس کا پر توڑ دیا ہو۔۔۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اُدھر چکور نے بھی۔۔۔ پھر میں نے گھٹنوں کے بل پر چلنا چھوڑ دیا اور سیدھا اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا اور عین اُسی وقت کہ میں اُسے دبوچنے کو تھا، چکور نے اپنے پَر پھیلائے اور اطمینان سے اُڑتا ہُوا ہَوا میں چکّر لگانے لگا اور میں گھبراہٹ میں ایک لگھواڑے کے درخت سے ٹکرا گیا اور نیلا دھاری کی جھاڑی میں جا گرا، اور وہاں سے لڑھک کر سبزے پر جو پھسلا ہوں تو بیر کے ایک بڑے جھاڑ کے نیچے جا کر ہی رُکا۔۔۔۔۔

یہاں پر ایک لڑکا چاقو کی مدد سے زمین کھود رہا تھا، میری ہیئت کذائی دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا، اور اپنی کمر پر۔۔۔ دونوں ہاتھ ٹیک کر قہقہے لگانے لگا، میں جلدی سے کپڑے جھاڑ کر اُٹھا اور گو میرے پاؤں اور بازو کانٹوں سے زخمی ہو گئے تھے، میں اس پر اپنی مٹھیاں بھینچ کر اُس کی طرف بڑھا، اور اُس سے پُوچھا: "کیوں ہنستے ہو جی"؟

ہو ہو ہو!!! اُس نے ہنستے ہنستے کہا: "معلوم ہوتا ہے تم اسکول سے بھاگے ہو"؟

"ہاں" میں نے مٹھیاں بھینچ کر جواب دیا "کیا تمہارے باپ کا

اسکول ہے ۔"

ہو! ہو ہو !!! وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ میرے باپ کا اسکول ہوتا تو تم وہاں سے بھاگ سکتے ؟ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں، اور آج تک ہمارا ایک گھوڑا بھی نہیں بھاگا۔۔!

"میں گھوڑا نہیں ہوں" میں نے غصّے سے کہا۔

ہو! ہو ! ہو !!! وہ چیخا، پھر اُس نے آگے بڑھ کر اک دم مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ اور اپنے قریب کھینچ کر بولا "جانتے ہو، میں چاقو سے زمین کیوں کھود رہا ہوں ؟

"کوئی خزانہ ہوگا ۔" میں نے ایسی لاتعلقی کے انداز میں کہا۔ جس میں ذراسی دلچسپی بھی پائی جاتی تھی، اس سے خفا ہونے کے باوجود میں اس گمشدہ خزانے میں دلچسپی لینے سے اپنے آپ کو کیسے روک سکتا تھا۔

"خزانہ نہیں ہے !" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں ہاتھ جھٹک کر کہا۔۔۔۔۔۔

"تو پھر جادو کی تختی ہوگی ۔" میں نے جواب دیا۔

نہیں، جادو کی تختی نہیں ہے ۔

تو پھر کیا ہے میاں

خُونی بُوٹی !

خُونی بوٹی ؟

ہاں خُونی بُوٹی، کبھی پیاز کھایا ہے تم نے، بس خونی بُوٹی کی شکل

بھی بالکل پیاز کی مانند ہوتی ہے۔ لیکن اس میں خون بھرا ہوتا ہے۔
خون؟ —— کس کا خون ہے۔ کسی جن کا خون ہے اس میں۔۔۔؟
"نہیں کسی جن ون بھوت کا خون نہیں۔ اس میں آدمی کا خون ہے"!
اُس نے جواب دیا اور میرے سارے بدن میں جھرجھری آگئی۔
"آدمی کے خون کو کیا کرتے ہیں"؛ میں نے اُس سے پوچھا۔

پیتے ہیں!
"پیتے ہیں؟" میں نے خوف زدہ ہو کر اُس سے پوچھا۔
ہاں بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اور میرا باپ کہتا ہے، جو لڑکا اس خونی بوٹی کا خون پی لے۔ وہ ہوا میں اُڑ سکتا ہے، اُونچا۔۔۔ اُڑن کھٹولے کی ضرورت نہیں رہتی۔
ارے واہ۔۔۔۔ میں نے خوشی سے تالی بجائی، اور اُس کا چاقو لے کر کہا:"لاؤ مجھے یہ زمین کھودنے دو۔"
"تم پرے ہٹ جاؤ" اس نے مجھے غصّے سے ڈھکیل کر کہا" یہ بوٹی میری ہے۔ اس کا خون میں پیوں گا۔"
نہیں میں پیوں گا۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ اور نہیں تو میں تمہیں یہ جگہ نہیں کھودنے دوں گا۔
وہ بولا۔ اچھا — تو ہم باری باری زمین کھودیں گے، جب جڑی نکل آئے گی تو اُس کا آدھا خون تم پی لینا، آدھا میں پی لوں گا، اور پھر ہم دونوں ہوا میں اڑ جائیں گے۔ میں نے خوشی سے کہا "اور ماسٹر کے سر پر

پیشاب کریں گے ۔۔۔ اور دُور بہت دُور پریوں کے دیس میں چلیں گے کامنی موسی کہتی تھیں ۔۔۔۔۔۔

وہ میری طرف غور سے دیکھ کر بولا: "تو تم بنگلے میں رہتے ہو۔" اُس کے لہجے میں حقارت تھی ۔

میں نے شرمسار سا ہو کر کہا: "ہاں" اور پھر — "تم کہاں رہتے ہو؟"

وہ بولا۔ میں اُس اُونچے پہاڑ پر رہتا ہوں۔ ہمارا گھر مٹی کا ہے۔ دو منزلہ ہے، تمہارا بنگلہ تو صرف ایک منزل کا ہے۔ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں۔ میرا نام امید ہے ۔۔۔۔۔۔

خُونی بُوٹی کی خاطر میں اُس سے لڑائی مول نہ لینی چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس شیخی خورے کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ ہو رہا۔ امید اور میں باری باری چاقو سے زمین کھودتے رہے۔ گھونگھے، چھوٹی چھوٹی سیپیاں، سفید، زرد اور سبز رنگ کے پتھر نکال کر اُن سے اپنی جیب بھرتے رہے، آخر میں ایک لمبی جڑ کے نیچے وہ پیاز کی گٹھلی سی نظر آئی، اور میں نے چیخ کر کہا۔ "خونی بُوٹی!"

"ہٹو۔ مجھے دیکھنے دو، کہاں ہے؟" امید چلّایا اور اس نے پھر مجھے دھکیل دیا۔ "ادھر لاؤ چاقو، تم کہیں اسے زخمی کر دو گے، اور سارا لہو گٹھلی سے نکل کر مٹی میں گھل جائے گا۔

"پرے ہٹو" اب وہ نہایت احتیاط سے اس گٹھلی کے ارد گرد کی زمین کو کھود رہا تھا ۔

آخر وہ بھورے رنگ کی گٹھلی جس کے چاروں طرف مٹی لگی ہوئی تھی صحیح و سلامت باہر نکال لی گئی، اب وہ امجد کی انگلیوں میں لٹک رہی تھی۔ اُڑن کھٹولے کی طرح ...... امجد آہستہ آہستہ اُس کی جلد پر سے مٹی اتارنے لگا۔ میں نے امجد سے کہا۔ اسے اچھی طرح تھامے رہو ورنہ یہ اُڑ جائے گی۔

تمہیں کیسے معلوم ہے ؟ اُس نے مجھ سے پُوچھا۔

میں جانتا ہُوں۔ میں نے کہا۔

امجد جب گٹھلی صاف کر چکا تو بولا " اب اس کا آدھا حصّہ کیسے ہوگا۔

"میں بتاؤں۔ اس کے بیچ میں چاقو سے ایک سوراخ، اور پھر اس سُوراخ کو انگوٹھے سے دبا دو اور قطرہ قطرہ کر کے منہ میں ٹپکاتے جاؤ۔ میرے منہ میں اور اپنے منہ میں۔ باری باری، لو اب جلدی کرو۔ مجھے اُڑ کر پریوں کے دیس جانا ہے"! میں نے کہا۔

امجد نے چاقو سے گٹھلی میں شگاف کیا اور وہاں انگوٹھا رکھ دیا، پھر اپنا منہ کھول کر اس نے انگوٹھے کے دباؤ کو ذرا سا ڈھیلا کر دیا، اور آدمی کا خُون اپنے منہ میں ٹپکانے لگا۔

وہ پہلا قطرہ .... میں اُس سُرخ خُونی قطرے کو دیکھنے کے لیے اس قدر بے تاب تھا کہ میرا مُنہ بھی بے اختیار کھل گیا۔ جیسے وہ قطرہ میرے منہ میں ہی ٹپکنے کو تھا۔

لیکن وہ قطرہ نہ ٹپکا۔
امجد نے انگوٹھے کو شگاف سے ذرا پرے سرکا دیا۔
اور پرے سرکایا۔
اور پرے سرکایا۔
بالکل ہٹا دیا
ارے!
گٹھلی سے خون کا قطرہ بھی نہ بہا۔
پھر جلدی سے گٹھلی کو چیرا گیا۔ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے
لیکن خون کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ بس پیاز کی مانند تہ بر تہ چھلکے تھے
اُس میں اور کچھ نہ تھا۔ ذرا سا لے کر چکھا۔ کڑوا زہر تھا۔
امجد نے اُسے لے کر ذرا نیچے پھینک دیا۔ اور پھر بولا۔
"یہ گٹھلی کچی ہے۔ ابھی اس میں خون پیدا ہی نہیں ہُوا۔۔۔!"

امجد اور میں ندی کے کنارے کنارے بہت دیر تک تیرتے رہے، اور جب تیرتے تیرتے تھک جاتے تو پانی سے نکل کر ریت پر لیٹ جاتے، اور سورج کی گرم گرم کرنوں اور ریت کی تپتی ہُوئی سطح سے اپنے جسم کو گرماتے۔ اور کسی چوڑے پتھر پر کانوں کو ٹیک کر اُن میں سے پانی نکالنے کی کوشش کرتے۔ یہاں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے، چھوٹے چھوٹے چرواہے اور چرواہیاں جو ان بڑی بڑی

گایوں، گھوڑوں اور گدھوں کے گلّوں کی اس چابک دستی سے نگہداشت کرتے تھے کہ مجھے تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح یہ دیو ہیکل جانور جو قریب ہی سبزے پر چر رہے تھے ان منھی چرواہوں کے رعب میں آ کر ان کے ہر اشارے کو حکم سمجھ کر بلا چون و چرا اُس کی تعمیل کرتے تھے۔

میں اور امجد ریت پر لیٹے تھے اور امجد کے قریب پارو لیٹی تھی اور پارو قریب دو تین اور لڑکے اور لڑکیاں ۔ ۔ ۔ اور پارو کے بھورے بھورے بال سورج کی کرنوں میں گہرے سنہری ہو گئے تھے، اور پارو مجھے بڑی اچھی لگی تھی اور ندی میں تیرتے وقت بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تیرتے رہے تھے، اور ایک دوسرے کے ساتھ تیرتے تیرتے ہم دونوں پتھر کی اِن سلوں پر آ کر بیٹھ جاتے جو ندی کے بڑے بہاؤ کو ہمارے تیرنے کی جگہ سے الگ کرتی تھیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے پارو سے کہا۔

"میں ندی کے بڑے بہاؤ میں بھی تیر سکتا ہوں۔"

"جھوٹ!" وہ بولی۔

"میں ہوا میں بھی اُڑ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اُڑ کر دکھاؤ" وہ بولی۔

میں نے کہا "اور میں پریوں کے دیس جا رہا ہوں آج مجھے کاہنی خوسی نے بتایا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پارو اپنا نچلا ہونٹ ایک عجیب ادا سے سکیڑ کر بولی،

"تو تم بنگلے میں رہتے ہونا۔"

ہاں! اور میرے بنگلے میں پیلے گلاب کی ایک بہت بڑی بیل ہے۔ تم نے پیلے گلاب دیکھے ہیں۔

"نہیں!" پارو بولی

اچھا۔ تو میں تمہیں بہت سے پیلے گلاب دوں گا، اور ایک ہار بناؤں گا تمہارے لیے۔

پارو اپنی پریشان لٹوں سے پانی نچوڑتے ہوئے بولی،

"اچھا تو ہم تم سے بیاہ کریں گے۔ امجد سے نہیں کریں گے۔"

امجد؟ میں نے کہا۔" امجد تو بدھو ہے۔ وہ تو اسکول بھی نہیں جاتا۔"

اتنے میں امجد تیرتا ہوا ہمارے قریب آیا، اور اس نے ہم دونوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیا۔ ہم پھر تیرنے لگے، اور پانی کی کلیاں ایک دوسرے پر پھینکنے لگے، ہتیلیوں میں پانی بھر کر اُسے اس طرح پھینکتے کہ پانی اک بلند دائرے کی صورت میں فضا میں بکھر جاتا۔ کبھی ہم دھب دھب ٹانگیں ہلا کر نقلی آبشار گراتے اور پانی کی سطح کو بلوئی ہوئی جھاگ میں تبدیل کر دیتے۔

اب ہم سب ریت پر لیٹے دھوپ کا لطف لے رہے تھے، پارو اور میں بالکل قریب لیٹے ہوتے، لیکن کمبخت، امجد بیچ میں آ کر پارو کے قریب اوندھا پڑ گیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی ریت میں گھسی ہوئی تھی۔ کالے کھردرے بالوں میں کیچڑ اور ریت تھی اور کان کی

لوؤں کے قریب ریت میں پانی کے دو میٹھے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے، وہ نیم باز نگاہوں سے کبھی مجھے کبھی پارو کو دیکھ لیتا۔

میں نے کہا: "پارو اور میں بیاہ کر رہے ہیں۔"

پارو مجھے دیکھ کر ہنسی۔

امجد نے غصّے سے پارو کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف۔۔۔۔

میں نے کہا: "اور پارو میرے ساتھ پریوں کے دیس جا رہی ہے۔"

امجد کی نگاہوں میں گویا خونی بوٹی کا لہو اُچھلنے لگا۔ اس نے قہر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس نے اپنی اُنگلیاں ریت میں گاڑ دیں اور اپنی مٹھیوں میں ریت بھینچ کر بولا: "یہ سچ ہے پارو؟"

پارو نے اپنی سنہری لٹ جو اُس کے رخسار پر لرزاں تھی، اپنے دانتوں کے درمیان رکھ لی اور چُپ چاپ ہنسنے لگی۔

امجد نے اپنی ریت سے بھری ہوئی مٹھیاں اُوپر اٹھائیں، اور وہ اُسی ریت کو میری آنکھوں میں جھونکنے کو تھا کہ ندی کنارے کسی نے آواز دی۔۔۔ "ہو جر بوٹی کھا گینو!"

یکایک بھوک سب پر غالب آ گئی۔ امجد کی مٹھیاں ریت سے خالی ہو گئیں، اور ہم سب لوگ ندی کے کنارے توت کے درخت کے نیچے چلے آئے۔ مکئی کی روٹی تھی اور گنبھار کا ساگ، ہر گھر سے گنبھار کا سالن آیا تھا۔ دو ایک گھروں سے یہ سالن بھی نہ آیا تھا۔ صرف مکئی کی روٹی تھی اور پسی ہوئی سُرخ مرچ اور نمک، پارو کے گھر

سے پیاز کی تین گٹھلیاں بھی آئی تھیں اور پارو نے اُنہیں جلدی سے پتھر کی ایک بڑی سی سِل پہ رکھ کر پیس ڈالا اور نمک، مرچ اور وہیں سے جنگلی پودینہ توڑ کر چٹنی بنا ڈالی۔۔۔۔ سب سے پہلے اُس نے مکئی کی روٹی پر چٹنی رکھ کر مجھے کھانے کو دی۔ پھر امجد کو۔ بعد میں خود۔ امجد اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ مجھے روٹی کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ پارو کے کندنی چہرے پہ اُس وقت اک عجیب معصوم، شریر، شوخ اور بھولی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ چہرہ، وہ مسکراہٹ مجھے اب بھی یاد ہے۔۔۔۔۔

کھانے کے بعد ہم لوگ ندی سے پانی پی رہے تھے کہ امجد نے مجھے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا۔ پارو چیخی، میں نے غصے میں آکر امجد پہ پانی پھینکا اور پھر ندی سے نکل کر اس سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔

امجد بولا۔ "بس اپنے بنگلے کو چلے جاؤ، سیدھے۔ پارو سے میں بیاہ کر رہا ہوں"۔

میں نے کہا۔ "نہیں۔ پارو سے میں بیاہ کروں گا۔ تُو تو مسلمان ہے پارو سے بیاہ کیسے کرے گا"۔

وہ بولا۔ "اس میں کیا ہے اور تم تو باہر کے رہنے والے ہو۔ تم پنجابی ہو۔ ہم کشمیری ہیں اور پھر تمہارا باپ بنگلے میں رہتا ہے"۔
بنگلے کا ذکر سن کر سارے چرواہے ہنسنے لگے۔

"اور پھر امجد دوسرے چرواہے اور چرواہیوں سے مخاطب ہو کر

کہنے لگا۔ دیکھا تم نے .... یہ لڑکا روز اسکول جاتا ہے۔"

اسکول پر پھر اک قہقہہ بلند ہُوا۔ اور میں نے تاؤ میں آکر امجد کو ایک گھونسا لگا دیا۔ امجد نے مجھے ..... جلد ہی ہم ایک دوسرے پر پل پڑے۔ گتھم گتھا ہو گئے اور لڑکے لڑکیوں نے ہمیں ایک حلقے میں لے لیا اور شور مچا مچا کر داد دینے لگے، تھوڑی دیر کے بعد میرا دم پھولنے لگا اور امجد نے مجھے زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ اڑی گھوڑا دے کر۔ اور میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اب میں بازی ہار چکا۔ اور ریت میری آنکھوں میں تھی، اور کانوں میں اور حلق، پھر بھی جب تلک میں نے اچھی طرح دانت کٹکٹا کر اُس کے بازو کو نہ کاٹ کھایا۔ امجد نے مجھے چھوڑا نہیں .... !

ایک لڑکے نے کہا۔" یہ غلط بات ہے۔ اس نے امجد کی بازو کو کاٹ کھایا ہے۔"

دوسرا بولا۔" ہاں یہ کشتی کے داؤ میں داخل نہیں۔"

تیسرا بولا۔" ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

ایک لڑکی بولی۔" اسے سزا ملنی چاہیئے۔ یہ ٹھیک نہیں لڑا ... "

پارو بولی۔" ہاں! اس لڑکے کے کپڑے یہاں رکھ لو۔ اس نے امجد کی بازو کاٹ کھائی ہے۔ یہ لڑکا ہے ... یا باؤلا کتا۔"

پھر سب چڑوا ہے" باؤلا کتا۔ باؤلا کتا"، کہہ کر مجھے چڑانے

لگے، میری آنکھیں جو پہلے ہی ریت سے جل رہی تھیں، اب غم و غصے سے بھر آئیں۔ اور میں دہاڑیں مار مار کر روتا ہوا ننگ دھڑنگ اپنے بنگلے کو روانہ ہوا اور دور تک چڑواہے اور چرواہیاں ناچ ناچ کر اور چیخ چیخ کر مجھ پر آوازے کستے رہے۔ "بنگلے کا باؤلا کتا۔ بنگلے کا باؤلا کتا۔"

کپڑے کھوئے۔ جوتا کھویا۔ جزدان کھویا اور ہر جگہ اچھی ٹھکائی ہوئی۔ ندی پہ۔۔۔۔ گھر پہ۔۔۔۔ اسکول پہ۔۔۔۔ لیکن مجھے کسی پہ غصہ نہ تھا۔ نہ امجد پہ۔۔۔۔ نہ گھر والوں پر۔۔۔۔ نہ مدرس پر۔۔۔۔ مجھے صرف پارو پہ غصہ آتا تھا اور رہ رہ کر آتا تھا۔۔۔۔ کم ذات کمینی۔۔۔۔ کہتی تھی، اس کے کپڑے چھین لو۔۔۔ ہائے ہائے نہ ہوئی اس وقت میرے پاس جادو کی چھڑی ورنہ کمبخت کو ایک پل میں چھپا بنا دیتا۔۔۔۔!

پارو میرے جذبۂ محبت کی پہلی شکست تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس وقت میں اس وجہ سے، اس شکست، اس رنج، ان آنسوؤں کو نہ پہچان سکا تھا۔ لیکن۔۔۔۔ شکستوں کے اس لمبے جلوس پہ جب کبھی مُیں مُڑ کر نظر دوڑاتا ہوں۔۔۔۔ تو حدِ نگاہ پر مجھے پارو کا کندنی چہرہ نظر آتا ہے، اس کی بھولی بھولی آنکھوں میں معصوم شرارت ہے، اور اپنے دانتوں میں اس نے ایک سنہری لٹ داب رکھی ہے اور خاموشی سے ہنس رہی ہے۔۔۔۔!

دوسرے دن شاید کوئی تیوہار تھا۔ اور میں نئے کپڑے پہنے بنگلے

کے باہر زرد گلاب کی بیل کے نیچے کھڑا تھا، اور اس امید میں تھا کہ کب ماں کمیرہ سے کر باہر آئیں اور میرا فوٹو اُتریے، اتنے میں امجد ہاتھ میں گوپھیا لیے دوڑتا ہوا وہاں سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا، کہنے لگا۔

"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

میں نے منہ پھیر لیا۔

اُس نے گلاب کے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی رنگا رنگ تیتریوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "آہا ہا، تمہارے ہاں تو بڑی اچھی تیتریاں ہیں۔ تم انہیں پکڑتے نہیں۔۔۔۔۔"

اُس کے لہجے میں بڑی ملائمت تھی۔ جیسے وہ مجھ سے معافی طلب کر رہا ہو۔ میرا دل بھی تھوڑا سا پسیجا۔ لیکن میں چپ ہو رہا۔ اُس نے اپنے گوپھیے میں ایک کنکر رکھ کر زور سے چلایا۔ اور بولا۔ "لو — یہ کنکر وہاں پارو کے گھر تک چلا گیا ہے۔ آج پارو نے نئے کپڑے پہنے ہیں

میں چُپ ہو رہا۔

"ہم مندر میں بیاہ کرنے جا رہے ہیں۔" وہ بولا۔

میں جواب دینے کو تھا کہ سامنے سے مجھے پارو آتی دکھائی دی، وہ اُجلے کپڑے پہنے اپنے باپ کی اُنگلی سے لگی چلی آ رہی تھی، اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ جس کے سر پہ ایک نہایت خوبصورت سبز رنگ کے ستاروں والی مخملی ٹوپی تھی اور پاؤں میں چرچر کرتا ہوا نیا جوتا تھا۔

یہ اس کے چاچا کا لڑکا ہے۔ امجد نے خود ہی مجھے بتایا۔ ۔ ۔ ۔
پارو نے ہم دونوں کو پیلے گلاب کی بیل کے نیچے کھڑے دیکھا۔ اس نے ہم دونوں کو ایک نگاہ بھر کے دیکھا اور پھر اک مغرور ادا سے مُنہ پھیر لیا، اور اپنے چچازاد بھائی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ پھر وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے پارو کے باپ کے آگے ناچتے ہُوئے دوڑنے لگے۔ پارو کا باپ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔
امجد کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اس نے نہایت احتیاط سے گوپھیے میں ایک کنکر رکھا اور اُسے ایک زناٹے کے ساتھ پارو اور اس کے ساتھی لڑکے کی طرف پھینکا۔ پارو نے مڑ کر ہماری طرف شریر نگاہوں سے دیکھا اور پھر مسکرا کر اس نے بالوں کی ایک لٹ اپنے دانتوں میں داب لی۔ اور پھر ناچتے دوڑتی آگے چلی گئی۔ ۔ ۔ ۔ !
امجد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔
"بڑی کمینی ہے پارو!"
"کم ذات ہے!" میں نے کہا۔
اور اس کا باپ تو دیکھو۔ وہ بولا "گنجا سڑے چمڑے کی طرح ------
میں نے کہا۔ اس کی ناک دیکھی؟ کھیلے کی طرح! ....
امجد بولا۔ اور اس لڑکے کا مُنہ کیسا تھا؟ جیسے ہُوا ڈھول --!

اور وہ چلتا کس طرح تھا۔ میں نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا
"بائکرٹ پتلے کی طرح!"
ارے وہ تیتری۔ آہاہاہا! امجد چلّایا۔
اور پھر ہم دونوں باڑھ پھاند کر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اس یاقوتی
تیتری کی طرف لپکے جو باغیچے میں ناچتی ہوئی جارہی تھی۔

خوشبو کا سفر

سی۔ ایل۔ کاوش

باندرہ اردو اسکول کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ بمبئی کے اردو، ہندی، مراٹھی گجراتی کے سب ادیب موجود تھے۔

دادا نند ساگر کہہ رہے ہیں۔

"یہ راستہ جو کرشن چندر سے منسوب ہوا ہے۔ یہ کرشن چندر کی عزت افزائی نہیں ہے۔ بلکہ کرشن چندر کے نام نے بمبئی کو فخر بخشا ہے۔"

بمبئی کے راستے روز کی طرح رواں دواں ہیں۔ لیکن ماہم کاز وے کے پاس بہت سے لیکھک بہت سے ادیب، اور سب سے زیادہ فلموں کے لکھنے والے جمع ہیں۔ دس بجے آج کرشن چندر مارگ کا افتتاح ہونا ہے۔ میں پہلے پہنچ گیا ہوں۔ میرے ساتھ فکر فہمی بھی ہولئے ہیں۔

"فکر فہمی میرے ساتھ ہر مقام پر ہوتے ہیں۔ اور طرح طرح کے سوال کرتے رہتے ہیں کبھی کبھی عجیب طرح کی پھبتیاں بھی کس دیتے ہیں۔ میں انہیں عموماً دوستوں سے دور رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے کان میں کچھ نہ کچھ پھونکتے رہتے ہیں۔

جیسے جیسے ٹریفک بڑھتا جا رہا ہے۔ ویسے ویسے دھوپ تیز ہوتی جا رہی ہے: ممبئی میں یہ مہینہ شدت کی گرمی کا ہے۔ فکر تونسوی نے کہا" بھائی! کہیں سائے میں چلو۔ یہ میں نے دیکھا سڑک پر کوئی درخت نہیں ہے۔ کہاں جاؤں؟

فکر تونسوی کہنے لگے یار عجیب اجاڑ رستے کا نام کرشن چندر مارگ رکھا ہے۔ کارپوریشن سے وہ جو زندگی بھر چنار کے درختوں اور گل مہر کے پھولوں پر ریجھتا رہا اسے یہاں جگہ ملی ہے!!!

میں نے کہا جگہ نہیں بھائی نام ہے۔ ابھی یہ راستہ نیا بنا ہے۔ یہ مارگ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور سیدھا محبوب اسٹوڈیو تک چلا جاتا ہے۔

کرشن کی لٹریری زندگی بھی لاہور کے پیسہ اخبار سٹریٹ سے شروع ہوئی تھی۔ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کی بھیڑ سے گزر کر پونا کے اسٹوڈیو تک جا پہنچی تھی۔ دیکھو تو راستہ کتنا کشادہ ہے۔ پہلے یہاں سمندر کی کھاڑی کا پانی بھرتا تھا۔ سرکار نے اس کھاڑی کو پاٹ کر میدان بنا دیا۔

اس میدان میں ایک بار" ہماری فلم رائٹرز ایسوسی ایشن نے ادیبوں کے مکان بنانے کی تجویز بھی تو سرکار کے سامنے رکھی تھی! فکر تونسوی نے مجھے یاد دلایا۔

جی ہاں رکھی تھی۔ کرشن چندر اور مہندر ناتھ کو ساتھ لے کر ہم نے سچیوالیہ کے کئی چکر کاٹے ممبئی کے وزیر کرشن چندر جی کی قدر کرتے تھے۔ ہمیں کرسی سے اُٹھ کر ملتے۔ چائے پلاتے وعدہ کرتے۔ مگر سرکار کا دامن ہمیشہ ادیبوں کے لئے تنگ ہی رہا۔ کرشن چندر کے دوست اور مہندر ناتھ کے کلاس فیلو شری اندر کمار گجرال اس وقت مرکز میں ہاؤسنگ منسٹر تھے۔ وہ ممبئی آئے۔ انہوں نے ہماری تجویز سنی۔ ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی میٹنگ میں بھی آئے۔ اور پھر کرشن جی سے وعدہ کر گئے کہ منسٹر سے مہاراشٹر گورنمنٹ کو قرضہ دلوا کر دانشوروں کے لئے یہاں مکان بنوا دیتے ہیں پھر آپ بیس سال میں قرضہ اُتار دیجئے گا۔ دس کروڑ کی اسکیم تھی۔ ہم خوش ہو گئے تھے۔ کرشن جی اس دن بہت خوش تھے اور

بھٹک رہے تھے۔ یہ سارا معاملہ گجرال جی کے ساتھ طے ہوا؟ — جہاں وہ نیپین سی روڈ پر ٹھہرے تھے۔ وہاں سے ہم لوگ اُٹھ کر آئے تو چرچ گیٹ کے ببیلی ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ کرشن چندر جی نے ایک ٹیلیگرام اندراجی کو دیا۔ ایسوسی ایشن کی طرف سے۔ جب وہ لکھا جارہا تھا تو میرے کان میں فکر تونسوی نے اس وقت بھی کہا کہ اب یہ مکانوں کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ کیونکہ تار کا کچا مضمون اس طرح کا تھا کہ گجرال کو بھی ہمارا انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ منسٹر ہونا چاہیئے۔ فلم رائٹرز کی تجویز تھی اور کرشن جی فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ میں نے فکر تونسوی کی یہ بات بمبئی میں دہرائی کہ اگر وہ ہاؤسنگ سے نکل کر انفارمیشن میں آگئے تو مکان کیا جھونپڑی بھی نہیں ملے گی۔ لیکن کرشن چندر جی نے کہا۔ نہیں کاوش جی گجرال صاحب کہیں بھی ہوں گے وہ دانشوروں کے مکانات ضرور بنوا دیں گے۔

تھوڑے دنوں کے بعد گجرال صاحب انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ منسٹر ہو گئے۔ اور ہمارے مکانوں کا مسئلہ سچ مچ کھٹائی میں پڑ گیا۔ فکر تونسوی اکثر مجھے کہا کرتے ہیں۔ میاں! وزیر اور فقیر کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ فقیر جانے کب اپنا کاسہ اُٹھا دے اور وزیر کب پانسہ پلٹ دے۔

میں آج تونسوی سے کہہ رہا ہوں چلو یار یہاں ادیبوں کے مکان تو نہیں بنے لیکن ایک عظیم ادیب کے نام سے تو یہ جگہ منسوب ہو گئی۔

فکر کچھ بولے نہیں ہنس دیئے۔ یہ استہزا ہے۔ یا دلی تسکین میری فہم سے باہر ہے۔

اب دس بج رہے ہیں کافی لوگ آچکے ہیں۔ فلم رائٹرز خاص طور پر موجود ہیں۔ سردار جعفری نے ایک میٹنگ میں فرمایا تھا۔ بمبئی میں فلم رائٹرز بھی منظم ہیں۔ کرشن چندر مارگ کے فنکشن کا بیڑا وہی اُٹھا سکتے ہیں۔

تب بھی فکر تونسوی نے دولتی جھاڑی تھی۔ میرے کان میں کہا تھا کہ اخراجات کی فہرست فلم رائٹرز کے ہاتھ میں تھما دی جائے گی۔ حالانکہ یہ کام اردو اکیڈیمی بھی کر سکتی ہے کرشن چندر اگر فلم رائٹرز

ایسوسی ایشن کے صدر تھے تو اردو اکیڈیمی کے بھی معزز ممبر تھے۔ میں نے فکر فہمی پر نئے پن کا الزام لگا کر اسے چپ کرا دیا تھا۔

اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن نے کرشن چندر مارگ کے فنکشن کا بیڑا اٹھا لیا باندرہ میں نیشنل لائبریری کا ہال بک کر لیا۔ ۱۳ر جون ۷۷ء ۱۹ کو یہ فنکشن طے ہوگیا تھا۔ میں اور پروفیسر پریم بیل ادیبوں کے پاس گئے۔ خواجہ احمد عباس صاحب سے بھی ملے اور سب کو آنے کے لئے کہا۔ مراٹھی کے ادیبوں کو بھی تیار کر لیا تھا۔ ہندی گجراتی سب لکھنے والوں کو مدعو کیا۔ اس وقت یہ سڑک بے نام تھی۔ اور ہل روڈ کا نام بدل کر کرشن چندر مارگ رکھا جانے والا تھا۔ لیکن باندرہ کے بھائیوں نے اس پر اعتراض اٹھایا کہ اس کا نام اگر بدلنا ہے تو ماؤنٹ میری کے نام پر ہونا چاہیئے۔ کرشن چندر کے نام سے بھائیوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

اور سارا پروگرام یک لخت کینسل ہوگیا۔ لیکن باندرہ کے کارپوریٹر اختر جمال قریشی صاحب بضد تھے کہ باندرہ میں ہی کسی سڑک کا نام کرشن چندر مارگ ہونا چاہیئے ــــ آج ان کی محنت اور کرشن چندر کے دوستوں کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ قریشی صاحب بھی سوٹ پہنے چشمہ لگائے کھڑے ہیں۔

دور سے ایک موٹر آرہا ہے اس پر جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اس میں کارپوریشن کے ورکس کمیٹی کے چیئرمین شری آر۔ ڈی پردال آرہے ہیں سب لوگ جو بے حرکت کھڑے تھے ان میں زندگی عود کر آئی ہے۔

سب لوگ بورڈ کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ یہ بورڈ ایک کھمبے پر لٹکا ہوا ہے۔ بورڈ پر پردہ پڑا ہے ــــ راستے کا افتتاح کرنے والے ہیں شیام پرشاد نگم۔ کرشن چندر کے جگری یار نے اس بورڈ کو بے نقاب کیا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں بورڈ پر ہار چڑھایا گیا۔

بورڈ پر انگریزی کے چکنے حروف نظر آرہے ہیں۔ کرشن چندر مارگ — ہندی میں بھی لکھا ہے۔
اسے آپ مراٹھی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا رسم الخط ایک ہی ہے۔

نکر فہمی میری طرف دیکھ کر دھیرے سے کہہ رہے ہیں یار اردو کے عظیم ادیب کا نام اردو میں کیوں نہیں لکھا گیا — میں نے کہا رسم الخط میں کیا رکھا ہے۔ نکر فہمی نے کہا یار کمال کرتے ہو یاد نہیں کلیشور نے اردو کانفرنس کے موقع پر کہا تھا کہ اردو کو ہندوستان کی دوسری زبان قرار دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور لپی کا جھگڑا ختم کر دینا چاہیے۔ ہندی لپی کو اپنا کر ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے کہا تھا کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لئے ہندی لپی کو اپنا لینا چاہیئے۔ مجروح سلطان پوری کی بھی یہی رائے تھی۔ کرشن چندر کتنے بگڑے تھے۔ اور پھر اردو۔ ہندی کے پرچوں میں کیا کیچڑ اچھلا تھا۔ کرشن چندر اُردو رسم الخط کے لئے ہی واویلا کر رہے تھے۔ اس زبان میں ان کے راستے پر ان کا نام نہیں لکھا گیا۔

میں سلمٰی جی کی طرف دیکھ رہا ہوں وہ رو رہی ہیں۔ اور انہوں نے کہا " کرشن چندر آج ایک راستہ ہو گئے " اب ہم لوگ باندرہ روڈ سکول میں آگئے ہیں۔

کچھ اہم ہستیاں اسٹیج پر ہیں۔ اس لئے اونچی ہیں۔ باقی پستیاں ہیں۔ اس لئے اسٹیج سے نیچی ہیں یہاں عوام نہیں سب ادیب ہیں۔ سب کا اپنا انداز ہے۔ سب دانشور ہیں۔ پھر یہ اونچ نیچ کیوں۔ نکر فہمی ایک شعر گنگنا رہے ہیں۔

ہر اک بلندی کا بار پستی لئے ہوئے دوش پر کھڑی ہے
گزرنے والے گزر رہے ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے
(احسان دانش)

بلندیوں سے خطاب ہو رہا ہے پستیاں سُن رہی ہیں۔

خواجہ عبدالغفور اردو اکیڈیمی کے سیکرٹری اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ادا کر رہے ہیں اور جیدہ

چیدہ ادیبوں کو پکار رہے ہیں۔ لوگ اسٹیج پر آتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

سامنے کرشن چندر کی تصویر رکھی ہے۔ تصویر پر کوئی ہار نہیں۔ یہی تصویر اُس دن فلم رائٹرز ایسوسی ایشن میں بھی تھی۔ جس دن کرشن چندر کا تعزیتی جلسہ تھا۔ کرشن چندر کی تیرھویں وہیں منائی گئی۔

آٹھ مارچ ۱۹۷۷ء کو کرشن جی کا انتقال ہوا تھا۔ کرشن چندر جی کے جسم کو بمبئی ہسپتال سے اٹھا کر مجروح سلطان پوری اور شیام کرشن نگم اور ڈاکٹر راہی معصوم رضا لائے تھے۔

ڈرائنگ روم کے فرش پر ان کو لٹا دیا گیا تھا۔ کرشن چندر کی پہلی بیوی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ سلمیٰ جی بھی قریب ہی تھیں۔

کرشن چندر کے چہرے پر موت کے آثار نہیں تھے۔ ایک سکون تھا ایک شانتی تھی۔ جیسے سارے فرض پورے کر چکے ہوں۔ اب کچھ کرنے کو باقی نہیں تھا۔ ان کے چہرے پر کوئی احساس بھی نہیں تھا۔ کوئی ایکسپریشن نہیں۔ کرشن چندر جی کی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا سو رہے ہیں۔

خواجہ احمد عباس، ظ انصاری، سردار جعفری۔ اعجاز صدیقی اندر کے کمرے میں تھے۔

سب چپ تھے۔ سلمیٰ کے آنسو روتے روتے سوکھ گئے تھے۔ وہ ایک تصویر کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھیں۔

موت کے غم سے چھٹکارا پانے کا راستہ فعال لوگوں کے پاس ہوتا ہے وہ فوراً کام پر لگ جاتے ہیں۔ تجہیز و تکفین کی مصروفیت انہیں غم سے ابھار لیتی ہے۔ میں نے پوچھا اب کیا کرنا ہے؟ میرا سوال سلمیٰ جی سے تھا لیکن جواب کسی اور نے دیا۔ غسل تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کرشن جی کے دل کے ساتھ جو پیس میکر آپریشن کر کے تین چار مہینے پہلے لگایا گیا تھا وہ ان کی خواہش کے مطابق مرنے کے فوراً بعد آپریشن کر کے نکال بھی لیا گیا تھا۔ تاکہ کسی دوسرے کے کام آسکے۔

"پٹیاں کھولنی بےکار ہیں۔ زخم دیکھنے سے کیا حاصل وہ زندگی میں کبھی اپنے زخم کسی کو نہیں دکھاتے تھے۔" رام چند ٹھاکر نے کہا:"گنگا جل چھڑک دو۔ کسی نے کہا آبِ زم زم لے آؤ۔"

دو بوتلیں آگئیں۔ گنگا جل اور آبِ زم زم۔

فکرتونسوی نے کہا "یار کرشن چندر تو بڑے سائنٹفک مزاج کے آدمی تھے۔ انہیں سائنس پر بے حد بھروسہ تھا۔ اعتماد تھا۔ تم لوگ توہمات میں پڑے ہو شراب اینٹی سیپٹک ہوتی ہے۔ اس کی بوتل بھی یہیں کہیں کرشن چندر جی کے پلنگ کے نیچے رکھی ہوگی۔ وہ چھڑک دو کرشن جی کی روح خوش ہو جائے گی۔"

میں نے کرشن جی کی طرف دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہہ رہے ہیں، مذہب اگر انسانیت سکھاتا ہے تو بہت اچھا ہے اگر تفاوت پیدا کرتا ہے تو میرے کام کا نہیں۔ سب لوگ خاموش تھے۔ کچھ لوگ آتے دروازے میں کھڑے ہوتے اور یہ پوچھ کر کہ کتنے بجے جنازہ اُٹھے گا چلے جاتے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ شاید جہاتما کبیر کی طرح یہاں بھی چادر تقسیم ہوگی۔ پھول بھی بٹ جائیں گے۔ کیونکہ ان کی ایک بیوی ہندو ہے۔ اور دوسری مسلمان لیکن سلمیٰ بھابی نے یہ نہیں ہونے دیا۔

کرشن چندر جس کمرے میں بیٹھ کر چکنے کاغذ پر اردو حروف لکھا کرتے تھے۔ وہاں پر تلاوت قرآن ہونے لگا ہے۔

کرشن چندر جی کی لاش کے پاس رام چندر ٹھاکر سنسکرت کے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ میں، کرشن جی کا لڑکا رنجن اور وشنو ملہوترہ ہم سب لوگ ارتھی کا سامان خریدنے چلے گئے۔

ریڈیو پر خبر آ چکی تھی۔ لوگ آئے جا رہے تھے۔ کرشن چندر کی ارتھی کو کندھا دینے کے لئے۔

اب باندرہ سکول میں قریشی کارپوریٹر بول رہے ہیں۔

کرشن چندر مارگ کا خیال ان کے دماغ میں تب آیا جب وہ اپنی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے تب صابو صدیق ہال کے ایک جلسے میں کرشن چندر جی نے کہا کہ ہم ہندوستانی مردہ پرست ہیں۔ زندگی میں کسی کی کوئی یادگار نہیں بناتے مرنے کے بعد پھول چڑھاتے ہیں۔ قریشی صاحب بتا رہے ہیں تب سے میں نے سوچا تھا کہ میں کرشن چندر کی یادگار ان کی زندگی میں ہی بنا کر رہونگا۔

اور پھر جب باندرہ کے حلقے سے چناؤ جیت گیا۔ تب میں نے کارپوریشن سے کرشن چندر مارگ کی تجویز منظور کرالی۔ کرشن چندر جی کو میں نے فون پر خبر دی کہ میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میرے نام کا راستہ اور مجھی سے مشورہ؟ لیکن میرے بہت کہنے پر انہوں نے کہا اچھا آٹھ مارچ کو آجایئے۔ میں اپنے دوستوں کو بلالوں گا۔

اور جب میں آٹھ مارچ کو ان کے مکان پر پہنچا تو لوگ جمع تھے اور وہ نہیں تھے۔ ان کی لاش رکھی تھی۔ میں سناٹے میں آگیا۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ انہوں نے آٹھ مارچ کو کیوں بلایا تھا۔ آٹھ مارچ کو ہی کیوں بلایا تھا انہوں نے ۔!"

تب ظ انصاری صاحب نے جواب دیا: شاید کرشن جی ہمیشہ سچ بولتے تھے:

ہاں کرشن چندر جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا ہم لوگ مرنے کے بعد یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ جو تجویز ان کی زندگی میں پاس ہوئی وہ آج اُن کی یادگار بن گئی۔

مجھے یاد آیا کہ آٹھ مارچ کو ایک دبلا پتلا آدمی اپنی آنکھوں میں آنسو سمیٹے زینے میں کرشن جی کی لاش کو سہارا دے کر ہمارے ساتھ اتارنے میں مدد کر رہا تھا۔ وہ یہی تھے اختر جمال قریشی باندرہ کارپوریشن کے کارپوریٹر۔

جب ہم کرشن جی کی ارتھی کمپاؤنڈ میں سجانے کے لئے بیٹھے تو گوردوارے سے ایک سردار جی آئے تھے۔ انہوں نے شبد اُچارن کیے۔ جو آپ کے سوجنی ہے پڑلیو کال کے ہاتھ جو پیدا ہوا وہ مرجائے

گا۔ موت کے ہاتھ پڑے گا۔

پھر ارتھی کو کندھوں پر اُٹھا لیا گیا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی اور رامانند ساگر سب سے آگے تھے ۔ پیچھے خواجہ احمد عباس تھے ۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا تھے ۔ ارتھی کو اٹھائے کندھے بدلتے ہم لوگ چلے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا اب کرشن جی کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں ۔ ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی بھی اپنی دھرم پتنی کے ساتھ آگئے ہیں ۔ خواجہ عبدالغفور بلندیوں پر کھڑے ان کو پکار رہے ہیں ۔ اسٹیج پر آجائیے یہاں آئیے ۔ فکر تونسوی مجھے کہنی مار رہے ہیں ۔ میں اب پڑ گیا ہوں ۔ فکر تونسوی سے میں نے کہا یار وہ تجھے اسٹیج پر نہیں بلائیں گے نہ تم اردو اکیڈیمی کے ممبر ہو نہ کسی اخبار کے ایڈیٹر ۔ تمہیں کون بلائے گا ۔ فکر تونسوی نے مسکرا کر کہا اور نہ کسی پریس کا مالک نہ کسی بنک میں میرا فکس ڈیپازٹ اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا ۔ عزیز قیسی نے گھوم کر پیچھے دیکھا ۔ فکر تونسوی کی ہنسی جم گئی ۔

آٹھ مارچ کو شمشان میں ۰۰ کے قریب آدمی تھے ۔ سب کرشن جی کے عزیز دوست ۔

شمشان کے پار سامنے قبرستان ہے ۔ اس میں ہم نے جاں نثار اختر کو دفنایا تھا ۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے اردو کے ادیب ٹپاپٹ مر رہے ہیں ۔

مہندر ناتھ بھی چلے گئے ۔ کرشن چندر جی کی سرپرستی میں اُن پر مہندر ناتھ یادگار نمبر نکلا تھا ۔ ہم نے بھی محنت کی تھی ۔ صابر دت نے خوب بھاگ دوڑ کی ۔ میں نے کرشن چندر جی سے کہا تھا کہ مہندر پر آرٹیکل آپ کا کب ملے گا ۔ انہوں نے آرٹیکل لکھا تھا میں نے پڑھ کر کہا تھا یہ مضمون مہندر ناتھ پر نہیں ہے آپ کی سوانح حیات کا ایک مضمون ہے ۔ کہنے لگے اپنی سوانح حیات لکھ ڈالوں گا ۔ وہ بھی ابھی پوری نہیں ہوئی اور یہ یہاں آگئے ۔ شمشان میں ۔ کون پوری کرے گا کرشن چندر کی زندگی کی کہانی ۔

جنازہ ایک درخت کے چبوترے پر رکھ دیا گیا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں۔
راما نند ساگر نے کہا کہ کرشن چندر اپنے ساتھ ادیبوں کو لے کر چلتے تھے۔ یہ ان کی بڑی خوبی تھی۔
کملیشور نے مجھے کہا کہ ہم ان کی سمادھی بنائیں گے۔ ان کی استھیاں سنبھال کر رکھ لینی چاہئیں۔
مجھے آج ان کی وصیت یاد آگئی۔

ایک دن مجھے اپنے گھر پر بلایا تھا۔ کمرے میں لے گئے۔ ٹائپ کئے کچھ کاغذ میرے سامنے رکھے اور کہا اس پر دستخط کر دو میں نے کہا پڑھ لوں تو کر دوں انہوں نے کہا تھا۔ پڑھنے نہیں دوں گا۔ میری وصیت ہے۔ میں نے پوچھا تھا اچھا یہ بتا دیجئے کیا لکھا ہے۔

انہوں نے کہا تھا کہ میری راکھ لدر دریا کو کچھ میں ڈال دینا۔ اور میں نے کتابوں کا بٹوارہ کر دیا ہے کچھ رنجن کے نام کر دی ہیں کچھ سلمیٰ جی کے نام اور میری وصیت کو تم ہی پورا کرو گے۔ میں نے دستخط کر دیئے تھے۔

شمیم احمد شمیم بھی کرشن چندر جی کی لاش کے پاس شمشان میں کھڑا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا "کب جائیں گے آپ؟"

"کل رات کو۔" میں نے کہا تھا اِن کی راکھ لے جائیے گا لدر دریا میں ڈالنے کے لئے۔ انہوں نے جواب دیا "ہاں لے جاؤں گا۔"

لاش کو چتا پر رکھ دیا گیا۔ رنجن نے آگ دکھا دی ہے۔ آریہ سماج کے پنڈت کمل جی ساگری کی آہوتیاں ڈال کر اشلوک پڑھنے لگے ہیں۔

جس درخت کے نیچے ہم نے ارتھی رکھی تھی اس درخت پر ایک چڑیا چپ چاپ بیٹھی تھی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ شاید اُس کا ساتھی بچھڑ گیا تھا۔ میرا دھیان سلمیٰ جی کی طرف چلا گیا۔ وہ گھر میں اکیلی بیٹھی ہوں گی۔ اس چڑیا کی طرح خاموش سلمیٰ نے پیار کیا تھا۔ آج اس کا پیار ٹوٹ گیا۔

سلمیٰ کا خاندان بہت مذہب پرست ہے۔ علی گڑھ کا صدیقی خاندان۔ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بیٹی ہیں۔ ہندوستان بھر میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ پاکستان بھی ان کے شاگردوں سے خالی نہیں ہے۔ ان کے طنز و مزاح اور ادیبانہ نقد و نظر کو پرستش کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

میں سوچتا ہوں سلمیٰ جی کے پیار کی کتنی مخالفت ہوئی ہو گی۔ ہندو اور مسلمان کے کتنے جھگڑے ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ یا سلمیٰ جی جانتی ہوں گی۔ یا پھر کرشن چندر جی جانتے ہوں گے۔ جواب یکایک خاموش ہو گئے۔

سلمیٰ زندگی میں کرشن چندر پر تنقید انہیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ ایک بار میں کرشن چندر اور سلمیٰ ہم لوگ سانتا کروز سے بیجوالیہ جا رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے میں کرشن چندر جی سے کہہ رہا تھا۔ آپ کے نزدیک ہندوستان اور پاکستان میں کل ملا کر آٹھ دس اردو کے ادیب ہیں۔ وہی ایکدوسرے کی نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ جب بھی جو رخ کھولتے ہیں۔ دوستوں اور ساتھیوں کی تعریف میں پل باندھتے ہیں۔ باقی انہیں کوئی ادیب اور شاعر نظر نہیں آتا۔ ہمارا تو ذکر ہی کیا آپ لوگوں نے مہندر ناتھ کی تعریف میں بھی کچھ نہیں کہا۔ کرشن چندر مسکرا رہے تھے۔ سلمیٰ جی کو غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے یکایک اس طرح مجھ پر حملہ کیا جیسے شیرنی اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے شکاری پر حملہ کرتی ہے۔ کہنے لگیں جب یہ لکھ رہے تھے۔ تب آپ کہاں تھے۔؟ شیرنی نے پنجہ مارا — میں نے کہا لاہور میں ہم بھی لکھ رہے تھے۔ ان کا ایک گروپ تھا ہم اس گروپ سے باہر تھے سلمیٰ جی کچھ کہنے جا رہی تھیں گویا دوسرا پنجہ مارنے والی تھیں کہ کرشن جی نے مسکرا کر سلمیٰ کی طرف دیکھا اور پھر ان کا پنجہ حملہ نہیں کر سکا۔

اب سلمیٰ کس کے لئے جھگڑا کرے گی اس کا پیار ہی نہیں رہا۔

رچتا نے آگ پکڑ لی ہے۔ شعلے بلند ہونے لگے ہیں — سُرخ شعلے — کرشن چندر جی سُرخ سویرا کے منتظر تھے۔ وہ نہیں آیا۔ مگر خود سرخ رو ہو گئے۔

چڑیا درخت سے بے تابانہ اُڑی ہے۔ درخت کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ اب وہ چتا کے اوپر والے چھپر پر آبیٹھی ہے۔ اور گردن اُٹھا اُٹھا کر ایک ایک کو دیکھ رہی ہے۔

میں کل کرشن جی سے آخری بار ملا تھا۔ وہ بمبئی ہسپتال INTENSIVE CARE وارڈ میں تھے۔ آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھی۔ میں ان کے لڑکے رنجن کے ساتھ صبح سے ایسپلینیڈ کورٹ میں کھڑا تھا رنجن پر مقدمہ سرکاری تھا۔ ایمرجنسی کی لپیٹ میں آگیا۔ کرشن جی نے مجھ سے کہا تھا سوائے آپ کے کون جائے گا۔ عدالت میں گودی والا بمبئی کا سب سے بڑا فوجداری وکیل کرشن جی کا دوست تھا۔ وہ ہائی کورٹ اور سیشن کورٹ کے مقدمے لڑنے والا کرشن چندر جی کے کہنے پر اس عدالت میں پیش ہو رہا تھا۔ سلمٰی جی اس کوشش میں تھیں کہ مقدمہ سرکار واپس لے لے آج پولیس پراسیکوٹر نے کہہ دیا تھا کہ ہم مقدمہ واپس لے رہے ہیں۔

عدالت نے ۱۸؍ مارچ تاریخ ڈال دی تھی۔

میں نے سوچا تھا اب کرشن چندر جی سے ملتا جاؤں پھر لوٹ کر نہیں آپاؤں گا۔

کرشن چندر اس کمرے میں تھے۔ جہاں تیسرے ہارٹ اٹیک کے وقت داخل ہوئے تھے اور — پیس میکر لگا دیا گیا تھا۔

پھر وہ تندرست ہو کر گھر آگئے تھے۔ تھوڑے دنوں میں انہیں ٹہلنے کی اجازت مل گئی تھی۔

ایک دن صبح مجھے بلوا بھیجا۔ اور کہا کہ بمبئی کے سب ادیبوں کی ایک میٹنگ آج یا کل تک میرے گھر پر بلوانی چاہیئے "آرٹ فورم" ایمرجنسی کے زمانے میں انہوں نے تشکیل دیا تھا۔ یہ آٹھ جنوری ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ میں باندرہ میں مراٹھی ادیب نیرودکر سے ملا۔ اُس نے بتایا مراٹھی

ساہتیہ سنگ کی میٹنگ پونا میں ہو رہی ہے سب لیکھک وہاں گئے ہیں۔ کل شام کو کرشن جی کے گھر میٹنگ رکھیے آج وہ سب لوگ پونا سے آ جائیں گے۔

پھر میں سندھی ادیبوں کے ہاں گیا۔ انہوں نے بھی کل شام کو آنے کا وعدہ کیا۔

گجراتی ادیبوں کو بھی مدعو کر لیا۔ ہندی ادیبوں کو بھی سوچنا دے دی۔

۹ر جنوری کی شام کو کرشن جی کے گھر پر میٹنگ ہوئی اور سب ادیبوں نے رجنی پٹیل اور چیف منسٹر شنکر راؤ چوہان میں اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ فکر فہمی نے میٹنگ میں پوچھا تھا۔ اس اعتماد کے اظہار کی کیا ضرورت ہے۔ کرشن چندر جی نے کہا سنا ہے دونوں ریزائن کر رہے ہیں فکر فہمی نے سوال کیا تھا۔ ریزائن دے رہے ہیں یا مانگا جا رہا ہے؟ کرشن چندر جی نے کہا۔ اس کی تحقیق کی ہمیں کیا ضرورت ہے۔ آرٹ فورم رجنی پٹیل اور چیف منسٹر میں اعتماد رکھتا ہے۔

انہیں اپنے مقام پر برقرار رہنا چاہیئے۔ یہ میری تجویز ہے۔ سب نے تجویز کی حمایت کر دی۔

میٹنگ کے بعد میں۔ پروفیسر پریتم بیل پنجابی کے ادیب۔ نیرو دکر مراٹھی لیکھک اور اُتم چندرن سندھی زبان کے ادیب ہم ٹی۔ وی اسٹیشن گئے تاکہ اس میٹنگ کی کارروائی کو دوردرشن سے نشر کروا دیا جائے۔ وہاں پر نیوز ایڈیٹر نہیں تھے۔ لیکن ٹی وی والوں نے خبر لے لی۔ اور کہا کہ نیوز ایڈیٹر کو دے دیں گے۔

وہاں سے ہم لوگ فلورا فونٹین گئے۔ سماچار کے دفتر میں خبر دی لیکن انہوں نے اسے نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے صاف کہا کہ لوگ پہلے ایسے سماچار بھیجتے ہیں پھر سیاسی دباؤ پڑتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں۔

نیرو دکر اور میں نے جواب دیا سب ادیبوں کے دستخط موجود ہیں۔ ان کے ایڈریس بھی ہیں۔ اور فون نمبر بھی لے لیجیئے اور ان سے پوچھ لیجیئے۔ بہل بولے اس وقت ہندی زبان کے ادیب

آپ کے سامنے حاضر ہیں پنجابی کے ادیب اردو کے، مراٹھی کے، اور سندھی کے ہمارے دستخط بھی موجود ہیں۔

سماچار والوں نے میمورنڈم کی کاپی رکھ لی مگر نشر کرنے کا وعدہ نہیں کیا۔ صاف کہا کہ ہمیں اوپر سے حکم ہوتا ہے تو سیاسی خبریں نشر ہوتی ہیں۔

میں نے ٹائمز آف انڈیا کو فون پر خبر دے دی تھی۔

دوسرے دن ٹائمز آف انڈیا میں تو خبر چھپ گئی مگر باقی سب بلیک آؤٹ تھا۔

کرشن چندر جی نے مجھے کہا۔ رجنی پٹیل کے دفتر کی معرفت یہ خبر نشر ہو سکتی ہے۔

میں صبح رجنی پٹیل صاحب کے گھر گیا۔ وہاں جہاں ہر روز بھیڑ ہوتی تھی آج رجنی اکیلے تھے۔ اور دہلی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہنے لگے آئیے! میں نے انہیں میمورنڈم دکھایا۔ اور کہا کہ اُسے اپنے دفتر کی معرفت سماچار کو نشر کرنے کے لئے بھجوا دیجئے۔ کل رات کو ہم سب ادیب گئے تھے۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ کسی اُوپر کے حکم کی تعمیل کی بات کر رہے تھے۔ رجنی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس اوپر سے بھی آرڈر آئے ہیں۔ اور میں آج دہلی جا رہا ہوں۔ مجھے پرائم منسٹر نے بلایا ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا۔ کہ پرائم منسٹر آپ کو بلا رہی ہیں۔

اور بقول سماچار دہلی سے آرڈر ہے سیاسی خبروں کے بلیک آؤٹ کا یہ کیا تضاد ہے۔

دہلی سے بیک وقت دو دو طرح کے حکم نامے جاری ہوتے ہیں!!!؟

رجنی پٹیل صرف اتنا کہہ کر چپ ہو گئے کہ دیکھ لیجئے۔

ہم نے وہ میمورنڈم پرائم منسٹر کو بھجوا دیا۔

پھر کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔

کرشن چندر دوستوں کے لئے سب کچھ کرتے تھے اور رجنی پٹیل ان کے گہرے دوست تھے۔ ادیبوں کے مکانوں کا مسئلہ ان کے سامنے بھی آکر ہم لوگ کرشن چندر کے ساتھ گئے تھے۔ یوں تو رفیق ذکریا (آسرن ڈیولپمنٹ) منسٹر بھی ان کے دوست تھے۔ اُن کے پاس بھی گئے۔ کہ زمین دلوا دیجئے۔ قیمت لے لیجئے۔ مکان ہم خود بنوالیں گے۔ مگر کچھ نہیں ہو سکا۔

آخر رجنی پٹیل کے ساتھ کرشن چندر اور رائٹرز ایسوسی ایشن کے دوسرے ممبر پربھاکر گُپتے کے پاس گئے۔ گُپتے صاحب نے ایک اسکیم کے تحت گورئی بورم وی میں نو نو ہزار روپے کے ۱۱۲ فلیٹ منظور کرائے۔

کرشن چندر جی نے یہ بھی منظور کروالیا کہ ہم اسکیم کے تحت ساڑھے چار ہزار روپے پیشگی نہیں دے سکیں گے تو گُپتے صاحب نے ہزار ہزار روپے کی اقساط منظور کرلی تھیں۔

مکانوں کا تصفیہ ہو گیا۔ روپیہ بھی جمع ہو گیا۔ لیکن ابھی تک مکان ہمیں ملے نہیں۔ مگر اُمید ہے کہ مل جائیں گے۔ یہ کام کرشن چندر جی کر گئے ہیں۔ مکان شاید فروری ۱۹۷۹ء تک ملیں گے۔ ہاؤسنگ بورڈ نے وعدہ کیا ہے۔ روپیہ بھی ان کے پاس ہے۔

آج شمشان میں رجنی پٹیل نہیں ہیں۔ سیاسی حالات بدل گئے ہیں کہیں بدل رہے ہیں۔ رجنی بمبئی میں نہیں ہوں گے۔

آگ کے شعلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ رنجن نے سب کو ہاتھ جوڑ دیئے ہیں۔ اب لوگ دھیرے دھیرے جا رہے ہیں۔

ہم لوگ ـ کرشن چندر کے گھر آگئے ہیں، سلمیٰ جی بیٹھی ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی بیٹی لوگوں کو چائے پلا رہی ہے۔

سب چُپ ہیں۔

میں نے سلمیٰ جی کو خبر دی ہے کہ کل صبح استھیاں اٹھائی جائیں گی۔ اور شام کو ان کی چِتا کی راکھ لُدّر دریا کے لئے شمیم صاحب ساتھ لے جائیں۔

سلمیٰ جی کہہ رہی ہیں "وہ آپ جانیئے مجھے تو تھوڑی سی راکھ لاکر آپ کو دینی ہوگی" حیران سا اُن کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ وہ بھی دیکھ رہی ہیں۔ میں نے پوچھا ہے کہ آپ کیا کریں گی راکھ، اور استھیاں لوگ گھروں میں نہیں رکھتے۔

"میں رکھوں گی اور وہ راکھ میرے ساتھ میری قبر میں دفن ہوگی"

یہ سُن کر میرا دل آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔ اور پاس بیٹھے ہوئے نکر فہمی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ہیں۔

سب خاموش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی معمول کے مطابق کرشن چندر جی اندر کے کمرے سے نکل کر آئیں گے۔ اور کہیں گے۔ تم سب چُپ کیوں ہو بھئی۔ سلمیٰ ان کو چائے پلاؤ لیکن کرشن جی نہیں آئے۔ باہر رات ہوگئی۔

آج اندھیری رات ہے چاند نہیں نکلے گا۔

چاند چھُپ گیا ہے۔

باندرہ سکول کے اسٹیج پر سلمیٰ جی کرشن چندر کے ادب پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں۔ راستے سڑکیں، فٹ پاتھ، اور ہسپتال، یہ کرشن چندر جی کے ادب میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ کرشن چندر جی کی ایک کہانی ہے نئی سڑک۔ آج کارپوریشن نے نئی سڑک ان کے نام سے منسوب کی ہے۔

ڈاکٹر ظ انصاری کہہ رہے ہیں کہ ہم کارپوریشن سے کہیں گے کہ اس سڑک پر دونوں طرف گُل مہر کے درخت لگائے جائیں۔ کیوں کہ کرشن چندر جی کو پھولوں سے بہت پیار تھا۔ اور ایک

ڈسپنسری بھی ہونی چاہیئے۔ اگر کارپوریشن یہ کام نہیں کرسکتی تو ہم کرسکتے ہیں۔ ہم ادیب اپنے ہاتھ سے گل مہر کے درخت یہاں لگائیں گے۔ انہیں سینچیں گے۔

نکر فہمی میرے کان میں کہہ رہے ہیں کہ ان کو شاید معلوم نہیں سمندر کے کنارے گل مہر کے درخت نہیں اُگتے۔

میں جھنجھلا گیا ہوں۔ یہ نکر فہمی بہت پریشان کرتے ہیں۔ اُن کے پاس سے اُٹھ کر میں پیچھے جا بیٹھتا ہوں — فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر ستیش بھٹناگر کارپوریشن کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ کہ انہوں نے ایسوسی ایشن کے صدر کرشن چندر کے نام پر ایک رستے کو منسوب کیا۔ باندرہ اس لئے موزوں ہے کہ یہاں اسٹوڈیو بھی ہے۔ مندر بھی ہے، مسجد بھی ہے، چرچ بھی ہے اور آریہ سماج بھی ہے۔

کرشن چندر جی کے لئے بمبئی میں اس سے زیادہ موزوں جگہ نہیں تجویز کی جاسکتی تھی۔

کملیشور جی بول رہے ہیں کہ کرشن چندر جی ہمیشہ ایک ہی راستے پر چلتے رہے۔ جس راستے کو انہوں نے پہلے دن سے اپنایا آخری دم تک اس راستے پر ڈٹے رہے اور جو لوگ راستے پر ڈٹے رہے اور جو لوگ راستے نہیں بدلتے۔ راستے ان کے ہو جاتے ہیں۔

ہال میں تالیاں بج رہی ہیں۔ نکر فہمی پھر میرے پاس آگئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں۔ میں ان سے پوچھوں کرشن چندر جی کی سمادھی کا کیا ہوا۔ استھیاں انہوں نے رکھوالی تھیں اور کہا تھا ہم سمادھی بنائیں گے۔ پھر کیا بھول گئے — ؟ استھیاں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن میں رکھی تھی۔

میں انہیں روک دیتا ہوں۔ اور کہتا ہوں میاں اُن کو یاد ہوگا۔ اور اگر بھول بھی گئے ہوں تو یہ موقع یاد دلانے کا نہیں ہے۔

فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے آفس سیکرٹری ہار لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے رامانند ساگر

سے کہا کہ کرشن چندر جی کی تسویر کو ہار چڑھا دیجئے۔ تصویر بنا ہار کے اچھی نہیں لگ رہی۔
ہار ساگر نے خواجہ عبدالغفور صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔

اور باندرہ کے جو دوسرے عیسائی کارپوریٹر ہیں۔ قریشی کے اشارے پر انہوں نے ہار چڑھایا ہے۔

قریشی صاحب کہہ رہے ہیں ہار تو ہم لے کر آرہے ہیں۔ مگر..... کرشن چندر کے ادب پر لٹریچر پر سب بول چکے ہیں۔

اب مجروح سلطان پوری کو پکارا گیا ہے۔ مجروح بھی کرشن چندر کے خاص دوستوں میں سے تھے۔
فکر تونسوی کہہ رہے ہیں کہ اب یہ غزل سنائیں گے ترنم میں۔

مجروح صاحب نے چند الفاظ کے بعد جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اور کہا نیاز حیدر خود نہیں آسکے۔ انہوں نے ایک نظم کہی ہے۔

کرشن ہر دور میں اوتار لیا کرتا ہے
ہر زمانے کو تیرے نام سے نسبت ہے وہی

کرشن چندر مارگ

(یہ نظم کرشن چندر مارگ کے افتتاح کے موقع پر لکھی گئی)

اور تیرے نام سے منسوب ہے جو رہگذر
جادۂ منزلِ عرفانِ حقیقت ہے وُہی

طرزِ نو جدت امروز کے دیوانے دل
کیا ہر اک دور کی دیرینہ صداقت ہے وُہی

تو کہاں ہے تجھے ہم ڈھونڈ رہے ہیں کب سے
تو نہ مل پر تجھے پالینے کی حسرت ہے وُہی

افتخارِ عظمت و اعزازِ ادب، شانِ وطن
جو تیری فکر نے بخشی ہمیں عزت ہے وُہی

تجھ کو اعزاز عطا کرنے کی جرأت ہے کسے
علم انمول ہے۔ انمول کی قیمت ہے وُہی

یاں تو ہے قدر شناسی بھی سیاست کی اسیر
تاجرانِ ادب و علم کی خصلت ہے وُہی

تیرے ہوتے جو ستم تھا وُہ تیرے بعد بھی ہے
اُن ستم زادوں کو اُردو سے عداوت ہے وُہی

لیکن اس دورِ پُر آشوب سے گھبرائیں کیا
سرفروشوں میں وہی عزمِ جسارت ہے وُہی

تُو نے جو شعلہ جگایا تھا ہمارے دل میں
ماتمِ شعلۂ ارمانِ بغاوت ہے وُہی

ہر نئی راہ پہ اُبھریں گے تیرے نقشِ قدم
تیرا اعجاز وہی تیری کرامت ہے وُہی

کرشن ہر دور میں اوتار لیا کرتا ہے
ہر زمانے کو تیرے نام سے نسبت ہے وُہی

★ ——— نیاز حیدر